ماہنامہ

اشراق

لاہور

اکتوبر ۲۰۱۸ء

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

”خدا کے دین میں اپنی طرف سے نئی نئی بحثیں پیدا کر کے اُس کے جو مختلف ایڈیشن تیار کیے گئے ہیں، وہ سب لوگوں کی ایجاد ہیں اور اُنھی نے دینِ حق کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کئی دینوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اِس تقسیم و تفریق کا خدا اور اُس کے بھیجے ہوئے نبیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

—— قرآنیات

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن وسنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن وسنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق و تنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشر و اشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن وسنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگی قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ماہنامہ
اشراق
لاہور

جلد۳۰ شمارہ ۱۰ اکتوبر ۲۰۱۸ء محرم الحرام/صفر المظفر ۱۴۴۰ھ

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
سید منظور الحسن

فی شمارہ 30روپے
سالانہ 300روپے
رجسٹرڈ 700روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر)
بیرون ملک
سالانہ 30ڈالر

فہرست

شذرات

ڈپریشن ـــــ اسباب اور علاج (۱) جناب جاوید احمد غامدی سے ایک گفتگو	سید منظور الحسن	۴

قرآنیات

البیان: الانبیاء ۲۱: ۷۸-۹۴ (۳)	جاوید احمد غامدی	۱۱

معارف نبوی

اخلاقیات (۴)	جاوید احمد غامدی/ محمد حسن الیاس	۲۳

سیر و سوانح

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا (۱۰)	محمد وسیم اختر مفتی	۳۲

مقالات

البیان: خصائص وامتیازات (۱)	رضوان اللہ	۴۴

اصلاح و دعوت

تفسیر اور تذکیر کا فرق	محمد ذکوان ندوی	۷۲
تنقیدی شعور	خورشید احمد ندیم	۷۹

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
www.ghamidi.net, www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
http://www.javedahmadghamidi.com/index.php/ishraq

شذرات

سید منظور الحسن

ڈپریشن ـــــ اسباب اور علاج

جناب جاوید احمد غامدی سے ایک گفتگو

(۱)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

[یہ تحریر استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کے ساتھ ہماری ایک گفتگو سے ماخوذ ہے۔ اس میں انھوں نے ڈپریشن کے اسباب کی نشان دہی کی ہے اور اپنے دینی اور سماجی علم کی روشنی میں اس سے نجات کے رہنما اصول واضح کیے ہیں۔ امید ہے کہ اس کی اشاعت قارئین کے لیے افادیت کا باعث ہو گی۔]

موجودہ زمانے میں ڈپریشن کا مرض بہت تیزی سے پھیل رہا ہے۔ اس کے مریضوں میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے۔ مرد، عورتیں، بڑے، چھوٹے، سب اس کا شکار ہیں۔ ہمارے ہاں اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگوں میں قناعت کا تصور کم و بیش ختم ہو گیا ہے۔ وہ اپنی شخصیت، استعداد اور حالات کو نظر انداز کر کے جلد از جلد ترقی کی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ترقی کی خواہش انسانی فطرت ہے، ہر آدمی اس کا طلب گار رہے، لیکن ترقی کو اپنے حالات، اپنی صلاحیت اور اپنی جدوجہد سے ہم آہنگ ہو کر چاہنا اور بات ہے اور ان سے غیر متعلق ہو کر محض ترقی کے خواب دیکھنا بالکل اور چیز ہے۔ اس طرح کے خواب جب پورے نہیں ہوتے تو آدمی پر مایوسی طاری ہوتی ہے جو بڑھتے بڑھتے بیماری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

بعض اوقات طبعی عوامل بھی اس مرض کا باعث بن جاتے ہیں۔ عمر کے کسی خاص حصے میں بدن میں پیدا ہونے والی کیمیائی تبدیلیاں یا جسم میں نمکیات یا دوسرے عناصر کا عدم توازن یا کوئی ذہنی صدمہ یا کوئی جسمانی عارضہ دماغ کو متاثر کرتا ہے جس کے نتیجے میں ذہن نارمل طریقے پر کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ مرض کا باعث اگر یہ چیزیں ہیں تو پھر دواؤں کی مدد سے اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں ایک اچھے سائکائٹرسٹ کا علاج بالعموم کفایت کر جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک خالص نفسیاتی عوامل سے پیدا ہونے والے مرض کا تعلق ہے تو اس میں فکری اور نفسیاتی اصلاح ناگزیر ہے۔ اس معاملے میں بھی اگر مرض حد سے تجاوز کر جائے تو دواؤں کی ضرورت پڑتی ہے، لیکن رویوں اور تصورات کی اصلاح کے بغیر اس سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے۔

اس مسئلے کے تین بڑے نفسیاتی عوامل ہیں:

پہلی چیز یہ ہے کہ ہم اس بات کو عقیدے کے طور پر تو مانتے ہیں کہ دنیا ایک آزمایش گاہ ہے، مگر شعوری احساس کے ساتھ اسے تسلیم نہیں کرتے۔ یعنی ہم اس کا زبانی اقرار تو کرتے ہیں کہ اس دنیا میں ہمیں ایک امتحان سے گزرنا ہے، لیکن اس کو دل و دماغ کا حصہ نہیں بناتے، اس کو زندگی کے ایک اساسی اصول کی حیثیت سے قبول نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مصیبت، ہر ناکامی اور ہر محرومی پر ہم شاکی اور دل برداشتہ ہو جاتے ہیں۔ ــــــ یہ کیا بات ہوئی کہ ساری ناکامیاں ہمارے ہی حصے میں آنی ہیں؟ کیا دکھ ہمیں ہی سہنے ہیں؟ گرنا ہے تو ہمیں ہی گرنا ہے؟ مصیبتیں جھیلنے کے لیے ہم ہی رہ گئے ہیں؟ تکلیفیں ہمارا ہی مقدر ہیں؟ محرومیوں نے ہمارا ہی گھر دیکھ لیا ہے؟ ــــــ ان جملوں کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس بات کو بطور اصول تسلیم ہی نہیں کیا کہ یہ دنیا ایک دارالامتحان ہے۔ یہی چیز ہے جو مایوسی اور ڈپریشن کا اولین باعث بنتی ہے۔ جب ہم اس دنیا کو امتحان کی نہیں، بلکہ نتیجے کی جگہ سمجھتے ہیں، جب ہم اسے جدوجہد کا نہیں، بلکہ جزا کا مقام تصور کرتے ہیں اور جب ہم اسے عارضی نہیں، بلکہ مستقل ٹھکانا مانتے ہیں تو پھر ہر مشکل، ہر مصیبت اور ہر ناکامی ہمارے لیے ڈپریشن کا باعث بن جاتی ہے۔

چنانچہ یہ ضروری ہے کہ اس بات کو شرح صدر کے ساتھ مانا جائے کہ یہ دنیا امتحان کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہ ایک آزمایش گاہ ہے۔ اس میں رنج و راحت، غربت و امارت اور ترقی و تنزل کی جو حالتیں انسان کو پیش آتی ہیں، وہ اسی سبب سے ہیں۔ اس میں کامیابیوں کی کوئی ضمانت نہیں دی گئی۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کی عمر بھر کی جدوجہد بالکل ناکام ہو جائے اور دوسرے کو پہلے ہی قدم پر کامیابی مل جائے۔ ایک آدمی پر غموں کے پہاڑ ٹوٹتے رہیں اور دوسرا ناز و نعمت سے مالا مال رہے۔ اس میں کامیابیاں اور ناکامیاں بنیادی طور پر انسان کی محنت اور صلاحیت سے متعلق نہیں

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ہیں۔اسی طرح تکلیفیں اور راحتیں بھی اصلاً انسان کے اوصاف کا نتیجہ نہیں ہیں۔کامیابی بھی آزمایش ہے اور ناکامی بھی آزمایش ہے۔ یہاں اگر بیماری ملتی ہے تو وہ بھی امتحان ہے، غربت ملتی ہے تو وہ بھی امتحان ہے، پستی ملتی ہے تو وہ بھی امتحان ہے، گم نامی ملتی ہے تو وہ بھی امتحان ہے، محکومی ملتی ہے تو وہ بھی امتحان ہے۔اسی طرح اللہ اگر صحت دیتا ہے، دولت دیتا ہے، عظمت دیتا ہے، شہرت دیتا ہے، اقتدار دیتا ہے تو اس کا مقصد بھی امتحان اور آزمایش ہے۔ رنج والم اور ناکامی ونامرادی ہمارے صبر کا امتحان ہے اور راحت ورأفت اور کامیابی وکامرانی ہمارے شکر کا امتحان ہے۔

یہ امتحان، یہ آزمایش اللہ کی اسکیم ہے جس میں سے ہمیں بہرحال گزرنا ہے۔لہٰذا ہمیں اسے محض ایک نظریے اور ایک عقیدے کے طور پر قبول نہیں کرنا چاہیے، ایک حقیقت واقعہ کے طور پر ماننا چاہیے۔اس حقیقت کو ہمارے شعور کا، ہمارے وجود کا حصہ بننا چاہیے۔ ہماری سوچیں بھی اس پر مبنی ہونی چاہییں اور ہمارا عمل بھی۔ یہ تبدیلی اگر ہمارے اندر آجاتی ہے تو پھر، ان شاء اللہ، ہم پر نہ مایوسی طاری ہوگی اور نہ ہم ڈپریشن کا شکار ہوں گے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ ہماری مجموعی تربیت صبر وشکر کی نفسیات پر نہیں ہے۔ ہماری مجموعی تربیت یہ ہے کہ جب ہمیں کوئی نعمت ملتی ہے تو اسے ہم اپنا استحقاق سمجھتے ہیں اور فخر وغرور میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور جب کوئی مصیبت، کوئی تکلیف آتی ہے تو اس کا الزام دوسروں پر عائد کر دیتے ہیں یا پھر اللہ سے شکایت کرنے لگتے ہیں۔قرآن مجید کے الفاظ ہیں کہ جب انسان پر کوئی تنگی آتی ہے تو کہتا ہے: 'ربی اھانن' یعنی میرے رب نے میری توہین کی، مجھے ذلیل کر دیا۔یہ ناشکری ہے۔سورۂ ہود میں انسان کے اسی رویے کو بیان فرمایا ہے:

> ''اور اگر ہم انسان کو اپنی رحمت سے نوازتے، پھر اُس سے محروم کر دیتے ہیں تو وہ مایوس ہو جاتا ہے اور ناشکری کرنے لگتا ہے، اور اگر اُس مصیبت کے بعد جو اُس پر آئی تھی، اُسے ہم نعمتوں سے نوازتے ہیں تو کہتا ہے کہ میری مصیبتیں ختم ہوئیں، پھر وہ پھولا نہیں سماتا اور اکڑنے لگتا ہے۔'' (۱۱: ۹-۱۰)

یہ درست رویہ نہیں ہے۔درست رویہ یہ ہے کہ ہم ہر مشکل اور ہر مصیبت میں صبر کو اختیار کریں اور عزم اور حوصلے کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں۔واضح رہے کہ صبر کسی عاجزی اور پستی کا نام نہیں ہے جسے لوگ اپنی بے بسی کی وجہ سے مجبوراً اختیار کرتے ہیں۔یہ استقلال، ثابت قدمی اور ہمت وجرأت کا اظہار ہے۔ جو لوگ زندگی کے مصائب ومشکلات کا حوصلے کے ساتھ سامنا کرتے، انھیں اللہ کی آزمایش اور اس کا فیصلہ سمجھ کر قبول کرتے اور اس پر اپنے قلب وذہن کو راضی اور مطمئن رکھتے ہیں تو یہی وہ لوگ ہیں جو قرآن کی اصطلاح میں صابرین ہیں۔ایسے لوگ خوشی اور مسرت کے موقعوں پر غرور اور تکبر میں مبتلا نہیں ہوتے اور غم اور مصیبت کے حالات میں مایوس اور بددل نہیں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہوتے۔ان پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ: 'اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ'، ''لاریب، ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں (ایک دن) اُسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے'' (البقرہ ۲: ۱۵۶)۔

صبر کے ساتھ شکر لازم وملزوم ہے۔ چنانچہ جہاں مصیبت آنے پر صبر کرنا ہے، وہاں نعمت ملنے پر شکر بجالانا ہے۔ ہم اپنے گردوپیش میں دیکھیں تو ہر طرف شکر کے مواقع بھرے پڑے ہیں۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو شکر کا موضوع بننا چاہیے۔ کسی چھوٹی نعمت کا وزن درحقیقت کتنا زیادہ ہے، اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ نعمت ہم سے چھن جاتی ہے۔ لہٰذا پینے کو ٹھنڈا پانی مل گیا ہے، اس پر شکر کیجیے۔ غسل خانے میں گرم پانی میسر ہے، اس پر الحمدللہ کہیے۔ صاف ہوا کتنی بڑی نعمت ہے، بعض علاقوں میں یہ میسر نہیں ہے، یہ بستر کتنی بڑی نعمت ہے، بہت سے لوگ ہیں جنھیں فٹ پاتھ پر سونا پڑتا ہے۔ یہ سب نعمتیں شکر کا تقاضا کرتی ہیں۔ اگر ہم غور کریں تو جو چیزیں دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ہمیں ملتی ہیں، ان کا شکر ادا کرنے کے لیے وہ چوبیس گھنٹے بھی کم ہیں۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعائیں ہمیں سکھائی ہیں، وہ اسی اظہار تشکر کے لیے ہیں۔ ایک دعا کے الفاظ یہ ہیں: 'اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ اَحۡیَانَا بَعۡدَ مَا اَمَاتَنَا، وَاِلَیۡہِ النُّشُوۡرُ'، ''شکر اللہ ہی کے لیے ہے جس نے ہم کو موت کے بعد پھر زندگی عطا فرمائی اور ایک دن لوٹنا بھی اُسی کی طرف ہے'' (بخاری، رقم ۶۳۱۲۔ مسلم، رقم ۶۸۸۷)۔ اللہ کی کسی نشانی کو دیکھ کر سبحان اللہ کہنا، کام کی ابتدا بسم اللہ سے کرنا، نعمت ملنے پر الحمدللہ کے کلمات ادا کرنا، یہ سب شکر گزاری کے اظہار کے لیے ہے۔ ایک مرتبہ مولانا اصلاحی نے پوچھا کہ دنیا کی سب سے بڑی دعا کون سی ہے؟ ہم میں سے کوئی جواب نہ دے سکا۔ کہنے لگے کہ سورۂ فاتحہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو دنیا میں جو سب سے بڑی نعمت ملی ہے، وہ اللہ کی ہدایت ہے اور سورۂ فاتحہ اس عظیم نعمت کی شکر گزاری کا اظہار ہے۔

ایک بات سمجھ لیجیے کہ ایسا نہیں ہوتا کہ لوگوں کو تکلیفیں نہیں آتیں۔ ان سے تو کوئی انسان محفوظ نہیں ہے۔ فرق یہ ہے کہ جو آدمی صبر اور شکر کی نفسیات میں جیتا ہے، وہ تکلیفوں کے بجائے نعمتوں کو اپنی توجہ کا مرکز بناتا ہے۔ ایسے کسی آدمی سے آپ ملیں تو یوں لگے گا کہ اس کو نہ کوئی تکلیف ہے، نہ کوئی بیماری ہے، نہ کوئی رنج ہے، نہ کوئی پریشانی ہے۔ لیکن اگر وہ بیان کرنا شروع کر دے تو معلوم ہو گا کہ تکلیفوں کی ایک دنیا ہے جس میں وہ جی رہا ہے۔ اصل میں ہوا یہ ہے کہ اس نے اس دنیا کو دارالامتحان سمجھا ہے اور صبر اور شکر کے رویے کو اپنا شعار بنایا ہے۔

ایک شخص کے سوال نے مجھے بالکل رلا دیا۔ کہنے لگا کہ میں بیس سال سے مفلوج ہوں، اٹھ کر باتھ روم نہیں جا سکتا، کیا میری نمازیں قبول ہو جائیں گی؟ یعنی اس کا اصل مسئلہ معذوری نہیں تھا۔ اس کا مسئلہ یہ تھا کہ اسے اپنے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مالک کی جو شکر گزاری کرنی ہے، اس میں کوئی کمی تو نہیں ہو رہی؟ مجھ سے امریکا میں کسی نے پوچھا کہ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہے کہ آپ کو اپنا وطن چھوڑنا پڑ گیا ہے؟ میں نے کہا کہ بھئی کس بات کی شکایت؟ میری قوم نے، میرے ملک نے میری صلاحیتوں کی ہمیشہ پذیرائی کی ہے، مجھے اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے ہجرت کرنا پڑی ہے، لیکن ہجرت کے بعد تو لوگ سڑکوں پر پڑے ہوتے ہیں اور انھیں بے شمار مسائل سے گزرنا پڑتا ہے۔ مجھ پر اللہ کا بڑا اکرم ہے کہ میں اطمینان سے اپنے گھر میں بیٹھا ہوں۔ میں اگر ایسے سوچوں گا تو پھر بڑے سے بڑا واقعہ بھی مجھ پر ڈپریشن نہیں طاری کر پائے گا۔

تیسری چیز یہ ہے کہ ہماری نفسیات اس طرح ڈھل گئی ہے کہ ہم صرف لینا جانتے ہیں۔ دینا جانتے ہی نہیں ہیں۔ ہم اپنی زندگی کی ابتدا ہی یہاں سے کرتے ہیں کہ ہمیں والدین سے لینا ہے۔ شادی کرتے ہیں تو تقاضا یہ ہوتا ہے کہ بیوی کو ہمارا خیال رکھنا چاہیے، بچوں کو سنبھالنا چاہیے، ہمارے والدین کی خدمت کرنی چاہیے۔ پھر جب زندگی آگے بڑھتی ہے اور بچے کچھ بڑے ہو جاتے ہیں تو ہم ان سے یہ توقع قائم کر لیتے ہیں کہ اب انھیں ہماری ناتمام تمناؤں کو پورا کرنا ہے، ہماری ساری خفتہ خواہشیں اب انھی سے متعلق ہیں، انھوں نے ہماری خدمت کرنی ہے، ہمارے بڑھاپے کا سہارا بننا ہے۔ رشتہ داروں سے بھی یہی مطالبہ ہوتا ہے کہ انھیں ہر موقع پر ہماری مدد اور حمایت کرنی چاہیے۔ دوست کہتے ہی اس شخص کو ہیں جو مشکل میں ہمارے کام آتا ہے۔ گویا ہماری نفسیات، ہمارے خیالات، ہمارے اقدامات، ہمارے رویے اس ایک محور کے گرد گھومتے ہیں کہ دوسرے نے مجھے کیا دیا ہے اور میرے ساتھ کیا کیا ہے؟ اس پر قائم نہیں ہوتے کہ میں نے اسے کیا دیا ہے اور اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟ ـــــ اس نے میرا خیال نہیں کیا، اس نے میری مدد نہیں کی، اسے میرا احساس کرنا چاہیے تھا، میری بات کو ماننا چاہیے تھا، میری ضرورت کو پورا کرنا چاہیے تھا، میرا مسئلہ حل کرنا چاہیے تھا، یہ اس پر میرا حق تھا جسے ادا کرنا اس کی ذمہ داری تھی ـــــ تقاضوں اور مطالبوں کی یہ تکرار شب و روز ہماری زبان پر جاری رہتی ہے۔

یہ تقاضے اور یہ مطالبے شک و شبہے اور شکوہ و شکایت کا باعث بنتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص بھی مسلسل ہماری توقعات پوری نہیں کر سکتا۔ رفتہ رفتہ اسے ہاتھ کھینچنا پڑتا ہے۔ بالآخر وہ دن آ جاتا ہے جب اس کی گنجایش ختم ہو جاتی ہے اور اسے اپنی معذرت پیش کرنا پڑتی ہے۔ یہیں سے گلے اور شکوے کے احساسات جنم لیتے ہیں۔ یہ احساسات کبھی یاس اور ناامیدی پیدا کرتے ہیں اور کبھی غم و غصے اور نفرت اور انتقام کے جذبات کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اصل میں لینا ہماری زندگی میں کہیں داخل ہی نہیں ہونا چاہیے۔ ہر انسان کو شعوری زندگی کے پہلے قدم پر یہ فیصلہ

کر لینا چاہیے کہ میں دینے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔ میرے لیے یہ دنیا لینے کی جگہ نہیں، دینے کی جگہ ہے۔ مجھے والدین کو بھی دینا ہے، بیوی کو بھی دینا ہے، بچوں کو بھی دینا ہے، دوستوں کو بھی دینا ہے، معاشرے کو بھی دینا ہے۔ چنانچہ والدین کا مسئلہ یہ ہونا چاہیے کہ یہ میرے بچے ہیں، انھیں پیدا کرنے کا فیصلہ میں نے کیا ہے، انھوں نے مجھے کوئی درخواست نہیں کی تھی۔ اب مجھے انھیں پالنا ہے، ان کی پرورش کرنی ہے، ان کو اچھا ماحول فراہم کرنا ہے، ان کی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے۔ مجھے یہ سب کچھ کسی صلے کی توقع کے بغیر کرنا ہے، کیونکہ یہ سب کچھ میرے فرائض میں شامل ہے۔ بچے جب بڑے ہو جائیں تو انھیں بھی والدین کے لیے اسی دینے کی نفسیات کو اختیار کرنا چاہیے۔ انھیں سوچنا چاہیے کہ یہ ہستیاں ان کے وجود میں آنے اور پرورش پانے کا ذریعہ بنی ہیں۔ باپ نے تربیت اور نگہداشت کا اہتمام کیا ہے اور ماں نے ولادت اور رضاعت کی مشقت برداشت کی ہے۔ بڑھاپے کی ناتوانی میں ہمیں انھیں وہی کچھ دینا ہے جو انھوں نے ہمیں بچپن کی ناتوانی میں دیا تھا۔ شوہر کو یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ خاتون میری خواہش پر دوسرے گھر سے آئی ہے، اس نے میرے گھر کو آباد کیا ہے، مجھے اس کا خیال رکھنا ہے، مجھے اس کو تربیت دینی ہے، مجھے اس کو تحفظ فراہم کرنا ہے۔ اسی طرح بیوی کو بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ اس شخص نے مجھ پر بھروسا کیا ہے، اپنا گھر بار میرے حوالے کیا ہے، میری ضرورتیں پوری کرنے کی ذمہ داری اٹھائی ہے، اب میرا بھی یہ فرض ہے کہ میں اس کی رفاقت کا حق ادا کروں، اس کے گھر کو سنبھالوں، اس کی پریشانیوں میں اسے حوصلہ دوں، اس کے والدین کو اپنے والدین جیسا مقام دوں اور ان کے ساتھ خدمت و بردباری کا وہی رویہ اختیار کروں جیسے میں نے اپنے حقیقی والدین کے ساتھ اختیار کر رکھا ہے۔ دینے کی یہی نفسیات استاد کو اختیار کرنی چاہیے، یہی شاگرد کو اختیار کرنی چاہیے، یہی اعزہ و اقارب اور دوست احباب کو آپس میں اختیار کرنی چاہیے۔

یعنی آپ کو موت تک بس ایک ہی بات سوچنی چاہیے اور وہ یہ کہ یہ انسان جو آپ کے ساتھ وابستہ ہوا ہے، آپ نے اس کے لیے اب تک کیا کیا ہے اور آیندہ کیا کرنا ہے؟ یہ تو سوال ہی نہیں ہے کہ اس نے آپ کے لیے کیا کیا ہے؟ چنانچہ مطالبہ آپ کے وجود سے نکل جانا چاہیے، تقاضا آپ کی ذات کا حصہ ہی نہیں رہنا چاہیے، توقعات سے آپ کو مجرد ہو جانا چاہیے۔ اقبال نے اسی کو ادا کیا ہے کہ —— اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل —— یعنی ایک بہترین انسان امیدوں اور سہاروں کی دنیا میں نہیں جیتا، بلکہ مقاصد کی دنیا میں جیتا ہے۔

اس زمانے میں پوری دنیا کی نفسیات اس بات پر قائم ہوگئی ہے کہ میرے حقوق کیا ہیں۔ افراد بھی اسی نفسیات کے اسیر ہیں اور اقوام بھی۔ ہر جگہ اپنے حقوق کا تحفظ اصل مسئلہ ہے۔ اس کے برعکس، آپ دیکھیے کہ قرآن مجید نے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حقوق کا لفظ ہی اختیار نہیں کیا۔ وہ فرائض کو بیان کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں حقوق انسانی کا کوئی منشور نہیں ہے۔ فرائض کی فہرست ہے جنھیں ادا کرنا ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ والدین کے بھی فرائض ہیں، اولاد کے بھی فرائض ہیں، شوہر کے بھی فرائض ہیں، بیوی کے بھی فرائض ہیں، عالم کے بھی فرائض ہیں، حکمران کے بھی فرائض ہیں، شہری کے بھی فرائض ہیں۔ سب فرائض ہی فرائض ہیں۔ اصل میں جب ہم اپنے فرائض ادا کرتے ہیں تو دوسروں کو ان کے حقوق ملتے ہیں اور جب دوسرے اپنے فرائض ادا کرتے ہیں تو ہمیں ہمارے حقوق ملتے ہیں۔ گویا ایک ہی نتیجے تک پہنچنے کے لیے دو اپروچز ہیں۔ ایک حقوق کی اپروچ ہے اور دوسری فرائض کی اپروچ ہے۔ ایک لینے کی اپروچ ہے اور دوسری دینے کی اپروچ ہے۔ اسلام حقوق کی نہیں، بلکہ فرائض کی اپروچ کو اختیار کرتا ہے اور لینے کی نہیں، بلکہ دینے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب آپ کو آپ کا کوئی حق نہیں ملتا تو آپ مایوسی اور ناامیدی کا شکار نہیں ہوتے، بلکہ اللہ کی رضا پر راضی اور مطمئن رہ کر زندگی کا سفر جاری رکھتے ہیں۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

قرآنیات

البیان
جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الانبیاء

(۳)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

وَدَاوٗدَ وَ سُلَیۡمٰنَ اِذۡ یَحۡکُمٰنِ فِی الۡحَرۡثِ اِذۡ نَفَشَتۡ فِیۡهِ غَنَمُ الۡقَوۡمِ وَ کُنَّا لِحُکۡمِهِمۡ شٰهِدِیۡنَ ﴿۷۸﴾ فَفَهَّمۡنٰهَا سُلَیۡمٰنَ وَ کُلًّا اٰتَیۡنَا حُکۡمًا وَّعِلۡمًا وَّ سَخَّرۡنَا

اور داؤد و سلیمان کو بھی ہم نے اپنی نعمت سے سرفراز فرمایا۔[۲۵۷] یاد کرو، جب وہ کھیتی کے مقدمے کا فیصلہ کر رہے تھے، جب اُس میں رات کے وقت کچھ لوگوں کی بکریاں جا پڑی تھیں[۲۵۸] اور اُن کا یہ فیصلہ ہم خود دیکھ رہے تھے۔[۲۵۹] سو ہم نے سلیمان کو وہ قضیہ سمجھا دیا اور ہم نے دونوں کو حکم اور علم عطا

۲۵۷۔ آیت میں 'دَاوٗدَ وَ سُلَیۡمٰنَ' کا نصب بھی اُسی طرح ہے، جس طرح اوپر 'نُوۡحًا' کا نصب بیان ہوا ہے۔

۲۵۸۔ اِس مقدمے کی اللہ تعالیٰ نے اِس سے زیادہ کوئی تفصیل نہیں فرمائی ہے کہ کسی کی بکریوں کا ریوڑ کسی کے کھیت میں جا پڑا تھا اور وہ نقصان کی تلافی کے لیے اپنا مقدمہ لے کر داؤد علیہ السلام کی عدالت میں آیا تھا، اِس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کا مقصد یہاں مقدمے کی روداد پیش کرنا نہیں ہے، بلکہ صرف یہ بتانا ہے کہ حضرت داؤد

مَعَ دَاوٗدَ الۡجِبَالَ یُسَبِّحۡنَ وَالطَّیۡرَ وَکُنَّا فٰعِلِیۡنَ ﴿۷۹﴾ وَعَلَّمۡنٰہُ صَنۡعَةَ لَبُوۡسٍ

فرمایا تھا۔[۲۶۰] اور پہاڑوں اور پرندوں کو ہم نے داؤد کا ہم نوا کر دیا تھا،[۲۶۱] وہ (اُس کے ساتھ) خدا کی تسبیح کرتے تھے،[۲۶۲] اور (اُن کے لیے یہ) ہم ہی کرنے والے تھے۔[۲۶۳] اور ہم نے اُس کو تمھارے

ایک حکمران اور پیغمبر ہونے کے باوجود اپنے فیصلوں میں کس قدر محتاط تھے اور کس طرح ہر وقت تیار رہتے تھے کہ اپنے سے فروتر کوئی شخص بھی اگر غلطی پر متنبہ کرے تو اُسے بغیر کسی تردد کے تسلیم کر لیں۔

۲۵۹؎ اِس لیے کہ پیغمبر کی حکومت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکومت ہوتی ہے۔ اُس کے تمام فیصلے براہ راست اُس کی نگرانی میں ہوتے ہیں۔ چنانچہ کسی جگہ اگر غلطی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ فوراً اُس کی اصلاح کر دیتا ہے۔

۲۶۰؎ یعنی اگرچہ دونوں کو صحیح قوت فیصلہ اور علم نبوت عطا ہوا تھا، لیکن حضرت داؤد اِس قضیے میں معاملے کی تہ تک نہیں پہنچ سکے۔ چنانچہ بیٹے نے رائے دی جو زیادہ صائب اور قرین عدل تھی اور اُنھوں نے اُسی کے مطابق فیصلہ فرمایا۔ اُس کو محض اِس لیے رد نہیں کر دیا کہ اِس سے اُن کے اجتہاد کا ضعف نمایاں ہوتا تھا۔

۲۶۱؎ آیت میں فعل 'یُسَبِّحۡنَ' کو 'طَیۡر' پر مقدم کر دیا ہے، دراں حالیکہ یہ 'جِبَال' اور 'طَیۡر'، دونوں سے متعلق ہے اور بظاہر اِس کو بعد میں آنا چاہیے تھا۔ اِس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ پرندوں کے نغمے تو ہم سب سنتے ہیں، لیکن پہاڑوں کی نوا سنجی ایک نادر بات تھی، چنانچہ ضروری تھا کہ اُسے نمایاں کیا جائے۔

۲۶۲؎ مطلب یہ ہے کہ داؤد علیہ السلام جس طرح عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرتے تھے، اُسی طرح دعا و مناجات کے لیے بھی کمال انابت کے ساتھ نغمہ سنج ہوتے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...تورات سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت داؤد نہایت خوش الحان تھے اور اِس خوش الحانی کے ساتھ ساتھ اُن کے اندر سوز و درد بھی تھا۔ مزید براں یہ کہ اُن کی تمام مناجاتیں گیتوں اور نغموں کی شکل میں ہیں اور یہ گیت الہامی ہیں۔ اِن گیتوں کا حال یہ ہے کہ زبور پڑھیے تو اگرچہ ترجمے میں اِن کی شعری روح نکل چکی ہے، لیکن آج بھی اِن کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دل سینے سے نکل پڑے گا۔ حضرت داؤد جیسا خوش الحان اور صاحب سوز و درد جب اِن الہامی گیتوں کو پہاڑوں کے دامن میں بیٹھ کر، سحر کے سہانے وقت میں، پڑھتا رہا ہو گا تو یقیناً پہاڑوں سے بھی اُن کی صداے بازگشت سنائی دیتی رہی ہو گی اور پرندے بھی اُن کی ہم نوائی کرتے رہے ہوں گے۔ یہ نہ خیال فرمائیے کہ یہ محض شاعرانہ خیال آرائی ہے، بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ اِس کائنات کی ہر چیز، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے،

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

لَّکُمْ لِتُحْصِنَکُمْ مِّنْۢ بَاْسِکُمْ فَھَلْ اَنْتُمْ شٰکِرُوْنَ﴿۸۰﴾
وَلِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ عَاصِفَةً تَجْرِیْ بِاَمْرِہٖٓ اِلَی الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْھَا وَکُنَّا

لیے ایک جنگی لباس کی صنعت سکھائی تھی تاکہ وہ تمھاری جنگوں میں تمھیں بچائے رکھے۔[۲۶۴] (وہ اِن سب نعمتوں کو پا کر اپنے پروردگار کا شکر ادا کرتا تھا)۔ پھر کیا تم بھی (اِس طرح) شکر گزار بنتے ہو؟[۲۶۵] ۷۸-۸۰

اور سلیمان کے لیے ہم نے تیز ہواؤں کو مسخر کر دیا تھا[۲۶۶] جو اُس کے حکم سے اُس سرزمین کی طرف

اپنے رب کی تسبیح کرتی ہے، لیکن ہم اُن کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ اُن کا یہ شوق تسبیح اُس وقت اور بھڑک اٹھتا ہے، جب کوئی صاحب درد کوئی ایسا نغمہ چھیڑ دیتا ہے جو اُن کے دل کی ترجمانی کرتا ہے۔ اُس وقت وہ بھی جھوم اٹھتے ہیں اور اُس کی لے میں اپنی لے ملاتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۵/۱۷۳)

۲۶۳؎ یعنی اِس میں اُن کا کوئی ذاتی کمال نہیں تھا، بلکہ یہ سب نعمتیں ہم ہی نے اُن کو عطا فرمائی تھیں۔

۲۶۴؎ مطلب یہ ہے کہ اُن کے دور میں سائنسی علوم میں بھی ایسی ترقی ہوئی کہ اعلیٰ درجے کی زرہیں بنائی گئیں جنھوں نے داؤد علیہ السلام کی فوج کو ناقابل تسخیر بنا دیا اور اِس کے نتیجے میں وہ دنیا کی سب سے بڑی سیاسی قوت بن گئے۔ آیت میں لفظ 'عَلَّمْنٰهُ' آیا ہے۔ اِس میں ضمیر کا مرجع داؤد علیہ السلام ہیں، لیکن اِس سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ اُسی طرح کی نسبت ہے، جس طرح ہم کہتے ہیں کہ تاج محل شاہ جہان نے بنایا تھا۔

۲۶۵؎ اوپر تین چیزوں کا ذکر ہوا ہے: ایک حق پرستی، دوسرے بندگی و انابت میں ایسا انہماک کہ پہاڑ اور پرندے بھی دعا و مناجات میں ہم نوا بن جائیں، تیسرے عظیم سیاسی قوت۔ اِس کے بعد وہ کون سی چیز ہے، جس کی انسان دنیا میں تمنا کر سکتا ہے؟ قرآن نے اپنے مخاطبین کو توجہ دلائی ہے کہ تم اپنی رفاہیت پر اکڑ رہے ہو۔ اِدھر ذرا خدا کے اِس بندے کو دیکھو کہ یہ سب نعمتیں پا کر بھی نہ اُس میں دین داری کا غرور پیدا ہوا اور نہ مال و دولت اور دنیوی اقتدار کی نخوت۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتا رہا، اُس کے مقابل میں کبھی سرکش نہیں ہوا۔ پھر کیا تم بھی سرکشی چھوڑ کر اِسی طرح خدا کے شکر گزار بنتے ہو؟

۲۶۶؎ یعنی خدمت میں لگا دیا تھا۔ آیت میں 'سُلَیْمٰنَ' کا 'ل' اِس بات کا قرینہ ہے کہ فعل 'سخرنا' یہاں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۲﴾

چلتی تھیں، جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں[۲۶۷] اور ہم ہر چیز کے جاننے والے تھے[۲۶۸]۔ اور شیاطین[۲۶۹] میں سے بھی ہم نے اُس کے تابع کیے تھے جو اُس کے لیے (سمندروں میں) غوطے لگاتے تھے اور اُس کے سوا دوسرے کام بھی کرتے تھے، اور ہم ہی اُن کو تھامے ہوئے تھے[۲۷۰]۔ ۸۱-۸۲

محذوف ہے۔

۲۶۷؎ یہ اُن علاقوں کے لیے الہامی صحائف کی خاص تعبیر ہے جو بنی اسرائیل کے لیے خاص کیے گئے تھے اور اُن کے لیے دینی اور دنیوی، ہر قسم کی برکتیں اُن میں رکھ دی گئی تھیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد کی بری قوت تو بہت تھی، لیکن اُن کی حکومت میں بحری قوت میں بے مثال ترقی حضرت سلیمان کے عہد میں ہوئی۔ اُنھوں نے ایسے بادبانی جہاز ایجاد کیے جو ہندوستان اور مغربی جزائر تک سفر کرتے تھے۔ اُن کا بحری بیڑا وقت کا سب سے زیادہ طاقت ور بیڑا تھا۔ بحر احمر میں اُس کا مرکز ترسیس تھا جو خلیج عقبہ میں واقع تھا اور بحر متوسط میں صور، طائر اور یافہ کی بندرگاہیں۔ اُس زمانے تک سمندری ہواؤں کو کنٹرول کرنے کا ذریعہ بادبان ہی تھے۔ یہی بادبان جہازوں کے لیے انجن کا کام دیتے تھے۔ حضرت سلیمان نے ایسے بادبان ایجاد کیے جو تند ہواؤں میں بھی جہاز کی آمدورفت میں خلل واقع نہیں ہونے دیتے تھے۔ وہ اپنی معینہ سمتوں میں، موافق و ناموافق ہر قسم کی ہوامیں، اپنے لمبے لمبے سفر بے خوف وخطر جاری رکھتے۔ یہ چیز چونکہ خدا کی سکھائی ہوئی سائنس کا ثمرہ تھی، اِس وجہ سے فرمایا کہ ہم نے سلیمان کے لیے تند ہوائیں مسخر کر دی تھیں جو اُس کے حکم سے چلتی تھیں۔'' (تدبرقرآن ۵/ ۱۷۵)

۲۶۸؎ یعنی اِس چیز کے بھی جاننے والے تھے کہ جس شخص کو ہواؤں پر یہ تصرف بخشا گیا، وہ فی الواقع اِس فضل وعنایت کا اہل ہے اور اِس کے بھی کہ وہ ہماری بخشی ہوئی قوتوں کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔

۲۶۹؎ یعنی شیاطین جن۔ دوسری جگہ قرآن نے اِس کی وضاحت کر دی ہے۔

۲۷۰؎ مطلب یہ ہے کہ وہ علم بھی ہمارا عطا کردہ تھا، جس سے اُنھیں مسخر کیا گیا تھا اور اُس کے بعد بھی اُن کے اصلی نگران ہم ہی تھے۔ اُن میں سے کسی کے لیے ممکن نہ تھا کہ بھاگ سکے یا حضرت سلیمان کے منشا کے

وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۸۳﴾

اور ہم نے ایوب پر بھی عنایت فرمائی تھی[۱۷۱]، جب اُس نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ میں آزار میں مبتلا ہوں اور تو سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے[۱۷۲]۔ (اُس نے پکارا)

خلاف کوئی کام کرے۔

۱۷۱؎ یعنی اُس کو بھی علم و حکمت سے اُسی طرح نوازا تھا، جس طرح اوپر جن پیغمبروں کا ذکر ہوا ہے، اُن کو نوازا تھا۔ قرآن میں ایوب علیہ السلام کا ذکر جس طریقے سے ہوا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی اسرائیلی پیغمبر تھے جو غالباً نویں صدی قبل مسیح میں کسی وقت ہوئے ہیں۔ بائیبل کا بیان ہے کہ یہ ابتدا میں بہت دولت مند تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...خدا نے اُنھیں بڑا خاندان اور بڑی دولت دے رکھی تھی۔ اُن کے سات بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ سات ہزار بھیڑیں، تین ہزار اونٹ، ایک ہزار بیل اور پانچ سو بار برداری کے گدھے اُن کے پاس تھے۔ اُن کے نوکر چاکر بھی بے شمار تھے۔ اہل مشرق میں اِس درجے کا مال دار کوئی اور نہ تھا۔ لیکن یہ تمام خدم و حشم رکھنے کے باوجود وہ خدا کے نہایت شکر گزار اور فرماں بردار بندے تھے۔ کبھی کسی برائی سے وہ آلودہ نہ ہوئے۔'' (تدبر قرآن ۵/ ۱۷۷)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۱۷۲؎ اِس دعا کا پس منظر سفر ایوب میں یہ بیان ہوا ہے کہ اِس قدر دولت مندی کے باوجود ایوب علیہ السلام کی نیکی، تقویٰ اور خدا پرستی پر شیطان اور اُس کے ایجنٹوں کو حسد ہوا اور اُنھوں نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ تمام نیکی، تقویٰ اور خدا پرستی اِس لیے ہے کہ خدا نے اِسے اتنا کچھ دے رکھا ہے۔ یہ سب نعمتیں اگر اِس سے چھین لی جائیں تو پھر دیکھیے گا، یہ بھی خدا کا شکر گزار نہ ہوگا۔ اِس کے بعد خدا کی آزمایشوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے مال و دولت اور خاندان کا صفایا ہوا، لیکن خدا سے مایوس ہونے کے بجاے ایوب علیہ السلام اُسی کے دروازے پر گر پڑے۔ سفر ایوب میں ہے:

''تب ایوب نے اٹھ کر اپنا پیراہن چاک کیا اور سر منڈایا اور زمین پر گر کر سجدہ کیا اور کہا: ننگا میں اپنی ماں کے پیٹ سے نکلا اور ننگا ہی واپس جاؤں گا۔ خداوند نے دیا اور خداوند نے لے لیا۔ خداوند کا نام مبارک ہو۔'' (۱: ۲۲)

اِس کے بعد وہ آزار شروع ہوا، جس کا ذکر دعا میں کیا گیا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ سفر ایوب کے مطابق ایوب علیہ السلام کے تلوے سے لے کر سر کی چاندی تک سارے جسم میں جلتے ہوئے پھوڑے نکل آئے

فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ فَكَشَفۡنَا مَا بِهٖ مِنۡ ضُرٍّ وَّاٰتَيۡنٰهُ اَهۡلَهٗ وَمِثۡلَهُمۡ مَّعَهُمۡ رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا وَذِكۡرٰى لِلۡعٰبِدِيۡنَ ﴿۸۴﴾

تو ہم نے اُس کی فریاد سن لی اور جس تکلیف میں وہ مبتلا تھا، اُس کو دور کر دیا اور اُس کے اہل و عیال بھی اُس کو دیے، بلکہ اُن کے ساتھ اتنے ہی اور بھی[۲۷۳]، اپنی خاص رحمت سے اور اِس لیے کہ یہ ایک یاددہانی ہو خدا کی بندگی کرنے والوں کے لیے۔۸۳-۸۴

اور وہ ایک ٹھیکرا لے کر اپنا جسم کھجاتے اور راکھ پر بیٹھے رہتے تھے۔ ایوب علیہ السلام نے یہ دعا اِسی موقع پر کی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اِس دعا کی اِس بلاغت کو ملحوظ رکھیے کہ حضرت ایوب نے اپنے دکھ اور درد کا حوالہ تو دیا، لیکن حرف مدعا کو زبان پر نہیں لائے، اُس کو خدا کی رحمت پر چھوڑ دیا۔ فرمایا کہ میں دکھی ہوں اور تو تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنا دکھ تیرے آگے پیش کرتا ہوں اور معاملہ تیری رحمت کے حوالہ کرتا ہوں۔ تو جو کچھ کرے گا، اپنی شان رحیمی کے مطابق کرے گا اور اُسی میں میرے لیے برکت و رحمت ہے۔ یہی وہ مقام ہے، جس کو مقام رضا کہتے ہیں۔ جو اِس مقام کو حاصل کر لیتا ہے، اُسی کو آخرت میں 'رَاضِيَةً مَّرۡضِيَّةً' کا درجہ حاصل ہوگا۔“ (تدبر قرآن ۵/۱۷۸)

۲۷۳۔ یعنی جب صبر و رضا کے اِس امتحان میں وہ کامیاب ہو گئے تو خدا نے وہ بھی دیا جو اُنھوں نے مانگا تھا اور وہ بھی جس کا وہ اپنی تواضع کے سبب سے اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھ رہے تھے:

”...خداوند نے ایوب کو، جتنا اُس کے پاس پہلے تھا، اُس کا دو چند دیا۔ تب اُس کے سب بھائی اور سب بہنیں اور اُس کے سب اگلے جان پہچان اُس کے پاس آئے اور اُس کے گھر میں اُس کے ساتھ کھانا کھایا... یوں خداوند نے ایوب کے آخری ایام میں ابتدا کی نسبت زیادہ برکت بخشی اور اُس کے پاس چودہ ہزار بھیڑ بکریاں اور چھ ہزار اونٹ اور ہزار جوڑی بیل اور ہزار گدھیاں ہو گئیں۔ اُس کے سات بیٹے اور تین بیٹیاں بھی ہوئیں ...اور اِس کے بعد ایوب ایک سو چالیس برس جیتا رہا اور اپنے بیٹے اور پوتے چوتھی پشت تک دیکھے۔“

(سفر ایوب ۴۲: ۱۰-۱۶)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وَاِسۡمٰعِیۡلَ وَاِدۡرِیۡسَ وَذَا الۡکِفۡلِ کُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۸۵﴾ وَاَدۡخَلۡنٰہُمۡ فِیۡ رَحۡمَتِنَا اِنَّہُمۡ مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۸۶﴾

وَذَا النُّوۡنِ اِذۡ ذَّہَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنۡ لَّنۡ نَّقۡدِرَ عَلَیۡہِ فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ

اور یہی عنایت اسمٰعیل اور ادریس اور ذوالکفل پر بھی ہوئی۔ یہ سب صبر کرنے والوں میں سے تھے[274]۔ اِن کو ہم نے اپنی رحمت میں داخل کر لیا۔ اِس میں شبہ نہیں کہ یہ (ہمارے) نیک بندوں میں سے تھے۔ ۸۵-۸۶

اور مچھلی والے (یونس) پر بھی[275]، جب وہ (اپنی قوم سے) برہم ہو کر چلا گیا[276] اور اُس نے خیال کیا کہ ہم اُس پر کوئی گرفت نہ کریں گے[277]۔ لیکن پھر اندھیروں میں[278] پکار اٹھا کہ (پروردگار)، تیرے

۲۷۴؎ یعنی اِن کو بھی اِسی طرح صبر و رضا کے امتحان سے گزارا اور یہ بھی ہر لحاظ سے ثابت قدم رہے۔ حضرت اسمٰعیل کا امتحان تو معلوم و معروف ہے، لیکن حضرت ادریس اور حضرت ذوالکفل کی سرگذشت حیات بالکل پردۂ خفا میں ہے۔ اُن کے بارے میں ہم اتنا ہی جانتے ہیں، جتنا قرآن نے یہاں اور دوسرے مقامات میں بیان کر دیا ہے۔

۲۷۵؎ پرانے صحیفوں میں اِن کا نام یوناہ آیا ہے۔ یہ عراق کے ایک قدیم شہر نینویٰ کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے، جس کی آبادی اُس وقت ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ اِن کو چونکہ مچھلی نے نگل لیا تھا، اِس لیے قرآن میں اِن کا ذکر ایک قسم کے پیار کے ساتھ اور اِس واقعے کی تلمیح کے لیے مچھلی والے کے لقب سے ہوا ہے۔

۲۷۶؎ رسولوں کے بارے میں خدا کی سنت ہے کہ اتمام حجت کے بعد اگر اُن کے مخاطبین بدستور رسول کے منکر بنے رہیں تو رسول کو حکم دیا جاتا ہے کہ اُن لوگوں کو چھوڑ کر وہ اُن کی بستی سے نکل جائے۔ اِس کے بعد لوگوں پر عذاب آ جاتا ہے۔ یونس علیہ السلام نے خیال کیا کہ اپنی قوم کو سمجھانے کے لیے جو کچھ میں کر سکتا تھا، کر چکا ہوں۔ یہ نہایت سنگ دل لوگ ہیں اور حق کی ناقدری کا فیصلہ کیے بیٹھے ہیں، اِس لیے اب اِن سے ہجرت کا وقت آ گیا ہے۔ چنانچہ خدا کی طرف سے اُس کا حکم ملے بغیر وہ اُن سے مایوس اور آزردہ ہو کر اُنھیں چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ اِسی واقعے کی طرف اشارہ ہے۔

۲۷۷؎ یعنی اُنھوں نے خیال کیا کہ میں چونکہ یہ اقدام اپنی طرف سے دعوت و تبلیغ کا حق ادا کر دینے کے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۸۷﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ

سوا کوئی الٰہ نہیں، تو پاک ہے، بے شک میں ہی قصوروار ہوں۔[۲۷۹] تب اُس کی دعا ہم نے قبول کر لی

بعد اور بالکل صحیح وقت پر کر رہا ہوں، اِس لیے اِس پر کسی گرفت کا اندیشہ نہیں ہے، لیکن اُن کا یہ خیال صحیح نہیں تھا، اِس لیے کہ قوم پر اتمام حجت ہوا ہے یا نہیں، اِس کا فیصلہ کوئی شخص اپنی رائے اور اجتہاد سے نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اِس پر گرفت ہوئی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''حضرت یونس کا یہ خیال بجاے خود ایک پاکیزہ جذبے پر مبنی تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے جو آزمایشیں مقرر کر رکھی ہیں، وہ لازماً پوری ہو کے رہتی ہیں۔ وہ قوم سے بے زار ہو کر، ایک کشتی میں، جو سفر پر روانہ ہونے کے لیے بالکل تیار کھڑی تھی، سوار ہو گئے۔ کشتی کچھ منزل طے کرنے کے بعد طوفان میں گھر گئی۔ جب طوفان کسی طرح ٹلتا نظر نہیں آیا تو ملاحوں نے اُس زمانے کے عام وہم کے مطابق یہ خیال کیا کہ ہو نہ ہو اِس کشتی میں اپنے آقا سے بھاگا ہوا کوئی غلام سوار ہو گیا ہے، جب تک اُسے پکڑ کر سمندر کے حوالے نہ کیا جائے گا، اِس طوفان سے نجات نہیں مل سکتی۔ بالآخر یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کشتی میں مفرور غلام کون ہے، قرعہ ڈالا گیا اور قرعہ ڈالنے کی خدمت، جیسا کہ سورۂ صافات میں اشارہ ہے، حضرت یونس ہی کے سپرد ہوئی۔ اِس کی وجہ غالباً یہ ہوئی ہو گی کہ تمام اہل کشتی میں لوگوں کو سب سے زیادہ ثقہ آدمی وہی نظر آئے ہوں گے۔ بہرحال قرعہ ڈالا گیا اور قرعہ حضرت یونس کے نام کا نکلا جس کے نتیجے میں وہ کشتی سے سمندر میں لڑھکا دیے گئے۔ سمندر میں اُن کو کسی بڑی مچھلی، غالباً وہیل نے نگل لیا۔*'' (تدبر قرآن ۵/ ۱۸۱)

۲۷۸؎ یعنی مچھلی کے پیٹ اور پاتال کی گہرائیوں کے اندھیروں میں، جہاں سے صرف زمین و آسمان کا پروردگار ہی کسی فریاد کرنے والے کی فریاد سن سکتا تھا۔ اِس میں جمع اندھیرے کی شدت اور اُس کے اطراف کی وسعت اور اُس کے ناپیدا کنار ہونے کو ظاہر کر رہی ہے۔

۲۷۹؎ اِس دعا کا ذکر صحیفۂ یونس میں بھی ہوا ہے اور اِسی مضمون کی ایک مفصل دعا نقل کی گئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس دعا میں اُن کی طرف سے طلب و تمنا کسی چیز کی بھی نہیں ہے۔ صرف اپنی تقصیر کا اعتراف و اظہار ہے۔ اعتراف تقصیر کے بعد اُنھوں نے اپنے معاملے کو اپنے رب پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ جو فیصلہ فرمائے، وہی حق ہے اور

* یہ تمام تفصیل صحیفۂ یونس اور قرآن کی تصریحات و اشارات پر مبنی ہے۔

وَ نَجَّیۡنٰہُ مِنَ الۡغَمِّ ؕ وَ کَذٰلِکَ نُــۨۡجِی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۸۸﴾

اور اُس کو غم سے نجات دی۔[۲۸۰] ایمان والوں کو ہم اِسی طرح نجات دیتے ہیں۔[۲۸۱] ۸۷-۸۸

اُسی میں حکمت و رحمت ہے، اِس لیے کہ وہ ہر عیب سے پاک ہے۔ سب سے پہلے خدا ہی کے معبود اور ملجا و ماویٰ ہونے کا اظہار کیا ہے، اِس کے بعد اُس کو ہر نقص و عیب سے پاک اور منزہ قرار دیا ہے، پھر اپنی تقصیر کا اعتراف فرمایا ہے کہ یہ جو کچھ پیش آیا، سرتاسر میری اپنی ہی غلطی کا نتیجہ ہے۔ میں نے خود ہی اپنی جان پر ظلم ڈھایا، میرے رب نے مجھ پر کوئی ظلم نہیں کیا۔'' (تدبرقرآن ۵/۱۸۳)

۲۸۰؎ یعنی اُس غم سے بھی نجات دی جو اُنھیں اپنی قوم کی طرف سے پیش آیا اور اُس غم سے بھی جس سے وہ اپنی قوم کو چھوڑنے کے بعد خدا کی گرفت کے باعث دوچار ہوئے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا قبول فرمائی اور مچھلی نے اُن کو ساحل کی ریت پر اگل دیا۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے اُن کے نڈھال جسم کو گرمی اور دھوپ کی تمازت سے بچانے کے لیے کدو یا اِسی قسم کی کوئی بیل اگا رکھی تھی، جس کے نیچے اُن کو پناہ ملی۔ جب اِس حادثے سے اوسان بجا ہوئے اور جسم میں کچھ جان آئی تو اُن کو پھر اہل نینوا کے پاس انذار کے لیے جانے کی ہدایت ہوئی۔ صحیفۂ یونس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس دوبارہ انذار کے لیے قدرت نے ایک موثر تقریب بھی پیدا کر دی۔ وہ یوں کہ وہ بیل جس کے سایے نے حضرت یونس کو امان دی تھی، کسی سبب سے دفعتاً سوکھ گئی۔ احسان شناس لوگ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے احسان کی بھی قدر کرتے ہیں۔ حضرت یونس کو اِس یادگار بیل کے یوں خشک ہو جانے کا احساس ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اِس پر اُن کو توجہ دلائی کہ ایک حقیر بیل، جس کے لگانے اور پروان چڑھانے پر تم نے کوئی محنت نہیں کی، سوکھ جانے پر تم یوں ملول ہوئے تو غور کرو کہ میں اُس عظیم نینوا کو کس طرح اپنے عذاب کے حوالے کر سکتا ہوں، جس کو میں نے پیدا کیا، جس کی پرورش کی اور جس کو پروان چڑھایا ہے؟ جاؤ، اُن کو پھر دعوت دو، شاید وہ نیکی کی راہ اختیار کریں اور میری رحمت کے مستحق ٹھیریں۔ اِس ہدایت کے مطابق حضرت یونس پھر اہل نینوا کے پاس انذار کے لیے گئے اور اُن کی اِس دوبارہ دعوت و تذکیر کا یہ اثر ہوا کہ بادشاہ سے لے کر نینوا کے عام باشندے تک سب کانپ اٹھے، سب خدا پر ایمان لائے، بادشاہ نے شاہی لباس اتار کر ٹاٹ کا پیرہن پہن لیا اور باشندوں کے نام فرمان جاری کیا کہ ہر کوئی اپنی بری راہ سے باز آ جائے، روزہ رکھے، خدا کے حضور زاری کرے اور توبہ وانابت کا سر جھکائے۔*'' (تدبرقرآن ۵/۱۸۱)

۲۸۱؎ اِس فقرے سے تمام سرگذشت مطابق حال ہو گئی ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے

* یہ تمام تفصیل صحیفۂ یونس اور قرآن کی تصریحات واشارات پر مبنی ہے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِىْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۸۹﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿۹۰﴾

اور زکریا پر بھی، جب اُس نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ میرے پروردگار، مجھے اکیلا نہ چھوڑ[۲۸۲] اور تو سب وارثوں سے بہتر وارث ہے[۲۸۳]۔ پھر اُس کی یہ دعا ہم نے قبول کی[۲۸۴] اور اُسے یحییٰ عطا فرمایا اور اُس کی بیوی کو اُس کے لیے بھلا چنگا کر دیا۔ اِس میں شبہ نہیں کہ یہ لوگ نیکی کے کاموں میں سبقت کرتے تھے اور امید و بیم کی ہر حالت میں ہم کو پکارتے اور ہمارے آگے سرافگندہ رہنے والے تھے[۲۸۵]۔ ۸۹-۹۰

صحابہ کو بھی اطمینان دلا دیا گیا ہے کہ اِس وقت جن تاریکیوں میں آپ لوگ گھرے ہوئے ہیں، وہ بھی ایک دن اِسی طرح کافور ہو جائیں گی۔

۲۸۲؎ یعنی اکیلا نہ چھوڑ، بلکہ کوئی ایسا وارث عطا فرما جو میری اور یعقوب کے خاندان کی دینی روایات کا حامل ہو۔ سورۂ مریم (۱۹) کی آیات ۵-۶ میں وضاحت ہے کہ حضرت زکریا کی بیوی بانجھ تھیں اور اُنھوں نے یہ دعا اُس وقت کی جب وہ خود بڑھاپے کی منزل میں داخل ہو چکے تھے۔ وہاں یہ سرگذشت تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے۔

۲۸۳؎ یہ جملہ دعا کے ایک خاص پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...مطلب یہ ہے کہ میں یہ دعا جو کر رہا ہوں، صرف اِس لیے کر رہا ہوں کہ تیرے دین کی خدمت کی جو سعادت اِس خاندان کو تیرے فضل سے حاصل رہی ہے، اُس سے یہ خاندان محروم نہ رہ جائے، ورنہ میں جانتا ہوں کہ تو جس کو چاہے گا، اِس خدمت کے لیے اٹھا کھڑا کرے گا، تو کسی کا محتاج نہیں ہے۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۱۸۴)

۲۸۴؎ یہ دعا ایک اعلیٰ دینی مقصد کے لیے تھی، اِس لیے درخور قبول ٹھیری۔

۲۸۵؎ یعنی خدا کے خالص بندے تھے۔ اُن کا کردار منافقانہ یا مشرکانہ نہیں تھا۔ یہ زکریا علیہ السلام کے خاص اہل بیت اور اُن سے وابستہ لوگوں کا ذکر ہے۔ اُن کے بنی اعمام اِس کے مصداق نہیں ہو سکتے۔ اُن کی

وَالَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۱﴾

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾ وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ

اور اُس خاتون پر بھی[۲۸۶] جس نے اپنا دامن پاک رکھا[۲۸۷] تو ہم نے اُس کے اندر اپنی روح پھونک دی[۲۸۸] اور اُس کو اور اُس کے بیٹے (عیسیٰ) کو دنیا والوں کے لیے ایک نشانی بنا دیا۔ ۹۱

(چنانچہ) یہ حقیقت ہے کہ یہ تمھاری امت ہے، ایک ہی امت[۲۸۹] اور میں ہی تمھارا پروردگار ہوں،

حالت جیسی کچھ تھی، وہ سورۂ مریم (۱۹) میں بیان ہو چکی ہے۔

۲۸۶؎ سیدہ مریم مراد ہیں۔ آگے جو صفت بیان ہوئی ہے، وہ اُن کے ساتھ ایسی خاص ہو چکی ہے کہ اُن کا نام لیے بغیر ہی قرآن کا ہر قاری سمجھ لیتا ہے کہ اُس کا مصداق کیا ہے۔

۲۸۷؎ اصل الفاظ ہیں: 'اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا'۔ اِس میں لفظ 'فَرْج' اندیشے کی جگہ کے معنی میں آیا ہے اور یہ عربی زبان میں اُسی طرح کا ایک محاورہ ہے، جس طرح 'سد الثلمة'، 'رتق الفتق' اور 'جبر الکسر' وغیرہ کے محاورات آتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے وجود کے اُن تمام حصوں پر پہرا لگائے رکھا، جہاں سے کوئی بدی راہ پا سکتی تھی۔ آگے اِسی کا صلہ بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں اپنی ایک عظیم نشانی کے ظہور کے لیے منتخب فرمایا اور اُن کے لیے اپنی وہ شان ظاہر فرمائی جو استاذ امام کے الفاظ میں، اِس آسمان کے نیچے کسی کے لیے بھی ظاہر نہیں فرمائی۔

۲۸۸؎ یعنی اُس کے ہاں بیٹے کی پیدایش کے لیے عام قانون سے ہٹ کر اپنا حکم اُسی طرح براہ راست نازل کر دیا، جس طرح آدم و حوا کے لیے نازل کیا تھا۔

۲۸۹؎ یہ تمام نبیوں کا ذکر کرنے کے بعد بطور خلاصۂ بحث فرمایا ہے کہ تم سب ایک ہی امت ہو، اِس لیے کہ جن کو اپنا پیشوا مانتے ہو، اُن سب کا دین اور اُن کی دعوت ابتدا سے انتہا تک ایک ہی ہے۔ اپنی اصل کے لحاظ سے وہ الگ الگ دین لے کر نہیں آئے، بلکہ ایک ہی طریقے پر اور ایک ہی پروردگار کے راستے کی دعوت دیتے رہے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بَیۡنَهُمۡ کُلٌّ اِلَیۡنَا رٰجِعُوۡنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَا کُفۡرَانَ لِسَعۡیِهٖ وَاِنَّا لَهٗ کٰتِبُوۡنَ ﴿۹۴﴾

اِس لیے میری ہی بندگی کرو۔[۲۹۰] مگر (یہ لوگ ہیں کہ) اِنھوں نے اپنے دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہے۔[۲۹۱] (تم اِن کی پروا نہ کرو)، یہ سب ہماری ہی طرف لوٹنے والے ہیں۔ پھر جو نیک عمل کرے گا اور ایمان پر بھی ہو گا[۲۹۲] تو اُس کی محنت کی ناقدری نہ ہو گی۔ ہم اُس کے لیے اُسے لکھ رہے ہیں۔۹۲-۹۴

۲۹۰؎ یہ اُس دعوت کا خلاصہ بیان کر دیا ہے جو خدا کے پیغمبروں نے ہمیشہ دی ہے۔

۲۹۱؎ یعنی خدا کے دین میں اپنی طرف سے نئی نئی بحثیں پیدا کر کے اُس کے جو مختلف ایڈیشن تیار کیے گئے ہیں، وہ سب لوگوں کی ایجاد ہیں اور اُنھی نے دین حق کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کئی دینوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اِس تقسیم و تفریق کا خدا اور اُس کے بھیجے ہوئے نبیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۲۹۲؎ اچھے عمل کی قبولیت کے لیے یہ لازمی شرط ہے۔ اِس کے بغیر خدا کے ہاں کسی عمل کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ اُس کے ہاں وہی عمل درخور قبول ہے جو اُس کے لیے اور اُس پر ایمان کے ساتھ کیا گیا ہے۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

معارف نبوی

جاوید احمد غامدی
تحقیق و تخریج: محمد حسن الیاس

اخلاقیات

(۲)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۱

عَنْ أَبِي الْحَوْرَاءِ السَّعْدِيِّ، قَالَ: قُلْتُ لِلْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ[۱]: مَا تَذْكُرُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ قَالَ: [أَدْخَلَنِي غُرْفَةَ الصَّدَقَةِ][۲]، أَذْكُرُ أَنِّي أَخَذْتُ تَمْرَةً مِنْ تَمْرِ الصَّدَقَةِ، فَأَلْقَيْتُهَا فِي فَمِي، فَانْتَزَعَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِلُعَابِهَا، فَأَلْقَاهَا فِي التَّمْرِ. فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ مَا عَلَيْكَ لَوْ أَكَلَ هٰذِهِ التَّمْرَةَ؟ قَالَ: ”إِنَّا لَا نَأْكُلُ الصَّدَقَةَ“[۳] قَالَ: وَكَانَ يَقُوْلُ: ”دَعْ مَا يَرِيْبُكَ إِلٰى مَا لَا يَرِيْبُكَ، فَإِنَّ الصِّدْقَ طُمَأْنِيْنَةٌ، وَإِنَّ الْكَذِبَ رِيْبَةٌ“[۴].

ابوحوراء سعدی کہتے ہیں: میں نے حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ باتیں یاد ہیں؟ انھوں نے فرمایا: ایک مرتبہ آپ مجھے اُس کمرے میں لے گئے، جہاں صدقے

کا مال پڑا ہوتا تھا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ میں نے صدقے کی ایک کھجور وہاں سے اٹھا کر اپنے منہ میں ڈال لی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس پر لگے ہوئے تھوک سمیت اُسے باہر نکالا اور دوسری کھجوروں میں ڈال دیا۔[۱] ایک شخص نے یہ دیکھا تو کہا: اگر یہ ایک کھجور کھا لیتے تو کیا ہو جاتا؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم صدقے کا مال نہیں کھاتے۔[۲] سیدنا حسن کا بیان ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے: اُن چیزوں کو چھوڑ کر جو شک پیدا کرتی ہیں، بے شبہ چیزیں اختیار کیا کرو،[۳] اِس لیے کہ سچائی اطمینان اور جھوٹ سراسر تردد اور خلجان ہے۔[۴]

۱۔ اِس لیے کہ صدقے کا مال آپ کے گھر میں امانت کے طور پر رکھا گیا تھا، جس میں کوئی ادنیٰ خیانت بھی آپ کسی طرح گوارا نہیں کر سکتے تھے۔

۲۔ یعنی وہ مال نہیں کھاتے جو لوگ ریاست کا نظم چلانے کے لیے زکوٰۃ اور خیرات کی صورت میں دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ امانت کے طور پر رکھا جاتا ہے اور اِس کی حفاظت اِسی شدت کے ساتھ کی جاتی ہے۔ چنانچہ اِس میں سے ایک کھجور کا لے لینا بھی نہ میں اپنے لیے جائز سمجھتا ہوں اور نہ اپنے گھر والوں کے لیے۔

۳۔ مطلب یہ ہے کہ حلال بھی واضح ہونا چاہیے اور حرام بھی۔ اِن کے درمیان میں اگر کوئی مشتبہ چیز ہے تو اُس سے اجتناب ہی بہتر ہے۔ خدا سے ڈرنے والوں کے لیے صحیح رویہ یہی ہے۔

۴۔ یہ نتیجے کے لحاظ سے فرمایا ہے، اِس لیے کہ سچائی پر قائم رہیں تو ضمیر مطمئن رہتا اور جھوٹ ایک کے بعد دوسرے جھوٹ کی طرف دھکیلتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ آخر میں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ آدمی نے ابتدا میں کیا کہا تھا اور اب وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اِسی چیز کو یہاں 'رِیْبَۃٌ'، یعنی تردد اور خلجان سے تعبیر کیا ہے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن مسند احمد، رقم ۱۷۲۳ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے راوی حسن رضی اللہ عنہ ہیں۔ اُن سے یہ روایت درج ذیل مصادر میں نقل ہوئی ہے:

مسند طیالسی، رقم ۱۲۶۲۔ مسند احمد، رقم ۱۶۶۲، ۱۷۲۴۔ سنن دارمی، رقم ۲۴۵۲۔ سنن ترمذی، رقم ۲۴۵۵۔ مسند بزار، رقم ۱۲۱۵۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۵۰۶۲۔ السنن الصغریٰ، نسائی، رقم ۵۶۴۴۔ مشکل الآثار، طحاوی، رقم ۱۷۹۹۔ صحیح

ابن حبان، رقم ۵۷۲۷۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۲۶۴۱۔ مستدرک حاکم، رقم ۲۱۰۶، ۲۱۰۷، ۷۰۹۶۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۰۰۱۱۔

۲۔ مسند احمد، رقم ۱۷۲۴۔

۳۔ مسند احمد، رقم ۱۷۲۵ میں یہاں 'إِنَّا آلَ مُحَمَّدٍ، لَا تَحِلُّ لَنَا الصَّدَقَةُ' کے الفاظ ہیں۔ اِسی کے ایک طریق میں 'اہل بیت' کا اضافہ بھی منقول ہے، روایت کے الفاظ ہیں: 'فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَإِنَّهَا لَا تَحِلُّ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ، وَلَا لِأَحَدٍ مِنْ أَهْلِ بَيْتِهِ' ''اِس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِس لیے کہ یہ اللہ کے رسول کے لیے جائز ہے، نہ اُس کے گھر والوں میں سے کسی کے لیے''۔ ملاحظہ ہو: رقم ۱۷۲۴۔

۴۔ صحیح ابن حبان، رقم ۵۷۲۷ میں 'صدق' کے بجائے 'خیر' اور 'کذب' کی جگہ 'شر' نقل ہوا ہے۔

۲

عَنْ أُمِّ كُلْثُوْمٍ بِنْتِ عُقْبَةَ،[۱] قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: ''لَيْسَ بِالْكَاذِبِ[۲] مَنْ أَصْلَحَ بَيْنَ النَّاسِ فَقَالَ خَيْرًا أَوْ نَمٰى خَيْرًا.''

ام کلثوم بنت عقبہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ نے فرمایا: وہ شخص جھوٹا نہیں ہے جو لوگوں کے درمیان صلح کرائے اور اِس کے لیے اچھی بات کہے یا کسی اچھی بات کو بڑھا کر بیان کر دے۔[۱]

۱۔ مطلب یہ ہے کہ اُس کی یہ بات اگرچہ خلاف واقعہ ہو گی، لیکن اللہ کے ہاں اُس کو جھوٹا قرار دے کر اُس کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا، اِس لیے کہ اُس نے یہ اپنے کسی فائدے یا دوسروں کو نقصان پہنچانے اور دھوکا دینے کے لیے نہیں، بلکہ خیر و صلاح کے جذبے سے کیا ہے اور خدا کے نزدیک یہ جذبہ ایسی محمود چیز ہے کہ اِس کے لیے جھوٹ اور مبالغے جیسی برائی کا مواخذہ بھی اٹھا لیا جاتا ہے۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن سنن ترمذی، رقم ۱۸۵۷ سے لیا گیا ہے۔ اِس کی راویہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا ہیں۔ اُن سے

یہ روایت اِن کتابوں میں نقل ہوئی ہے:

الجامع لمعمر بن راشد، رقم ۸۰۴۔ مسند طیالسی، رقم ۱۷۵۰۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۵۹۸۱۔ مسند اسحاق بن راہویہ، رقم ۲۱۰۱۔ مسند احمد، رقم ۲۶۶۳۰، ۲۶۶۳۱، ۲۶۶۳۲، ۲۶۶۳۳، ۲۶۶۳۷، ۲۶۶۳۹۔ مسند عبد بن حمید، رقم ۱۶۰۱۔ الادب المفرد، رقم ۳۸۰۔ سنن ترمذی، رقم ۱۸۵۷۔ صحیح بخاری، رقم ۲۵۰۸۔ صحیح مسلم، رقم ۲۵۰۸۔ سنن ابی داؤد، رقم ۴۲۷۶، ۴۲۷۷۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۸۳۲۱، ۸۷۸۲۔ مشکل الآثار، رقم ۲۴۶۳، ۲۴۶۴، ۲۴۶۵۔ صحیح ابن حبان، رقم ۵۸۵۱۔ المعجم الصغیر، طبرانی، رقم ۱۸۸۔ مسند شامیین، طبرانی رقم ۳۰۰۰۔ مسند شہاب، رقم ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۹۱۸۴، ۱۹۱۸۵، ۱۹۱۸۶۔

۲۔ صحیح بخاری، رقم ۲۵۰۸ میں 'الْكَاذِب' کے بجاے صیغۂ مبالغہ 'الْكَذَّاب' نقل ہوا ہے۔

۳

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ،[۱] قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ، فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِيْ إِلَى الْبِرِّ، وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِيْ إِلَى الْجَنَّةِ، وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ وَيَتَحَرَّى الصِّدْقَ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ صِدِّيْقًا، وَإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ،[۲] فَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِيْ إِلَى الْفُجُوْرِ، وَإِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِيْ إِلَى النَّارِ، وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَكْذِبُ وَيَتَحَرَّى الْكَذِبَ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ كَذَّابًا".[۳]

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سچائی کو اختیار کرو، اِس لیے کہ سچائی نیکی کی طرف رہنمائی کرتی ہے، اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے۔ (یاد رکھو)، آدمی سچ بولتا ہے، پھر بولتے بولتے اللہ کے نزدیک 'صدیق' لکھ دیا جاتا ہے۔ اور جھوٹ سے بچو، اِس لیے کہ جھوٹ گناہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور گناہ دوزخ میں لے جاتا ہے۔ (یاد رکھو)، آدمی جھوٹ بولتا ہے، پھر بولتے بولتے اللہ کے نزدیک 'کذاب' لکھ دیا جاتا ہے۔[۱]

۱۔ یہ وہی بات ہے جس کے لیے سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۸۱ میں 'اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ' (اُن کے گناہ نے اُنھیں پوری طرح گھیر لیا ہے) کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نیکی ہو یا بدی، دونوں پر مداومت ہی آدمی کو

اُس آخری اور فیصلہ کن نتیجے تک پہنچاتی ہے جس کے بعد وہ نیک یا بد کے لقب کا مستحق ٹھیرتا ہے۔ اِس سے پہلے زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے فلاں نیکی یا بدی کا ارتکاب کیا ہے۔ چنانچہ بڑے سے بڑے گناہ کا مرتکب ہو جانے کے بعد بھی اُس کے پاس موقع ہوتا ہے کہ وہ توبہ اور ندامت کی توفیق پائے اور اپنے آپ کو اُس گناہ کے نتائج سے بچا لینے میں کامیاب ہو جائے۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن صحیح مسلم، رقم ۴۷۲۷ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے راوی عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ اُن سے یہ روایت درج ذیل مصادر میں منقول ہے:

الجامع لمعمر بن راشد، رقم ۶۸۱۔ مسند ابو داؤد طیالسی، رقم ۲۴۲، ۲۹۶۔ مسند ابن ابی شیبہ، رقم ۳۸۰۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۵۰۱۱۔ مسند احمد، رقم ۳۵۹۷، ۳۸۸۵، ۳۹۵۵، ۳۹۸۶، ۴۰۱۸، ۴۰۴۴۔ سنن دارمی، رقم ۲۶۳۲۔ صحیح بخاری، رقم ۵۶۵۶۔ الادب المفرد، رقم ۳۸۱۔ صحیح مسلم، رقم ۴۷۲۴، ۴۷۲۵، ۴۷۲۶۔ مسند بزار، رقم ۱۴۹۵۔ مسند الشاشی، رقم ۴۶۵، ۴۶۶۔ مسند ابی یعلیٰ، رقم ۵۰۷۷، ۵۳۰۶۔ تہذیب الآثار، رقم ۱۴۸۵، ۱۴۸۶۔ صحیح ابن حبان، رقم ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۸۴۳۳۔ مستدرک حاکم، رقم ۴۰۳۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۹۴۹۱۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۲۱۹۱۷، ۲۱۹۴۷۔

۲۔ معمر بن راشد کی الجامع میں اِس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب یہ اضافہ نقل ہوا ہے: 'إِيَّاكُمْ وَالْعِضَةَ، أَتَدْرُونَ مَا الْعِضَةُ؟ النَّمِيمَةُ' ''اپنے آپ کو 'الْعِضَة' سے دور رکھو، جانتے ہو کہ 'الْعِضَة' کیا ہے؟ یہ چغلی ہے''۔ ملاحظہ ہو: رقم ۶۸۱۔ ایک دوسرے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے 'الْعِضَة' کو اِن الفاظ سے واضح فرمایا: 'نَقْلُ الْحَدِيثِ مِنْ بَعْضِ النَّاسِ إِلَى بَعْضٍ لِيُفْسِدَ بَيْنَهُمْ' ''یہ ایک کی بات دوسرے تک اِس غرض سے پہنچانا ہے کہ اُن کے درمیان فساد پیدا ہو''۔ یہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، اور السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۹۴۹۲ میں نقل ہوئی ہے۔

۳۔ تہذیب الآثار، طحاوی، رقم ۱۴۸۶ میں اِس جگہ یہ اضافہ ہے: 'فَإِنَّ الْكَذِبَ لَا يَصْلُحُ بِالْجِدِّ وَلَا بِالْهَزْلِ، وَلَا يَعِدِ الرَّجُلُ صَبِيَّهُ مَا لَا يَفِي لَهُ بِهِ' ''اِس لیے کہ جھوٹ بولنا نہ سنجیدگی میں موزوں ہے اور نہ مذاق میں، اور آدمی کو اپنے بچے سے بھی کوئی ایسا وعدہ نہیں کرنا چاہیے جسے وہ پورا نہ کر سکے''۔

۴

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ،[1] أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ''آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ،[2] [وَإِنْ صَلّٰى وَإِنْ صَامَ وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ] [3] إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ''.

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: منافق کی تین نشانیاں ہیں، اگرچہ وہ روزے رکھتا ہو، نمازیں پڑھتا ہو اور خود کو مسلمان سمجھتا ہو: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب امانت لے تو اُس میں خیانت کرے۔[1]

۱۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے جو آپ کے زمانے میں جھوٹے مومن بنے ہوئے تھے۔ مطلب یہ تھا کہ جو لوگ فی الواقع منافق ہیں، وہ دوسروں کے سامنے اپنی دین داری کی نمایش کے لیے نماز روزے کا اہتمام تو کر سکتے ہیں، لیکن اپنے اخلاقی وجود کو ہمہ وقت پاکیزہ بنا کر نہیں رکھ سکتے۔ چنانچہ اِس امتحان میں لازماً ناکام ہو جاتے اور بالآخر پہچان لیے جا سکتے ہیں کہ وہ دل سے مسلمان نہیں ہوئے، اُنھوں نے ایمان و اسلام کا محض ڈھونگ رچا رکھا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن صحیح مسلم، رقم ۹۲ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے راوی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ اُن سے یہ روایت درج ذیل کتابوں میں نقل کی گئی ہے:

مسند احمد، رقم ۸۴۸۴، ۸۹۵۰، ۱۰۷۰۸۔ صحیح بخاری، رقم ۳۳، ۲۴۹۸، ۲۵۵۷۔ صحیح مسلم، رقم ۹۲، ۹۳۔ سنن ترمذی، رقم ۲۵۷۴۔ السنن الصغریٰ، النسائی، رقم ۴۹۶۱۔ السنن الکبریٰ، النسائی، رقم ۱۰۶۱۴۔ مسند ابی یعلیٰ، رقم ۶۴۹۷۔ مستخرج ابی عوانہ، رقم ۳۱، ۳۲، ۳۳۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۰۵۹۵، ۱۱۷۵۲، ۱۱۷۵۳۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ یہی روایت عبد اللہ بن عمرالسہمی رضی اللہ عنہ، عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔ اِن صحابہ سے یہ روایت درج ذیل مصادر میں نقل ہوئی ہے:

مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۵۰۲۲، ۲۵۰۲۳، ۲۵۰۲۴۔ مسند احمد، رقم ۶۵۹۲، ۶۶۸۶، ۶۷۰۳۔ مسند عبد بن حمید،

رقم ۳۳۰۔ صحیح بخاری، رقم ۳۳، ۲۲۹۱، ۲۹۵۸۔ سنن ترمذی، رقم ۲۵۷۵۔ سنن ابو داؤد، رقم ۴۰۷۰۔ مسند بزار، رقم ۱۴۹۸۔ السنن الصغریٰ، النسائی، رقم ۴۹۶۰، ۴۹۶۳۔ السنن الکبریٰ، النسائی، ۸۴۱۳۔ مستخرج ابی عوانہ، رقم ۳۰۔ صحیح ابن حبان، رقم ۲۵۷، ۲۵۸۔

۲۔ عبداللہ بن عمرالسہمی رضی اللہ عنہ سے مروی بعض طرق میں 'آیَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ' کے بجائے 'أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ فَهُوَ مُنَافِقٌ خَالِصٌ' کے الفاظ نقل ہوئے، یعنی چار خصلتیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں بھی ہوں گی، وہ منافق ہوگا۔ پھر چوتھی خصلت یہ بیان فرمائی ہے: 'وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ' ''اور جب جھگڑے تو بدزبانی پر اتر آئے''۔ ملاحظہ ہو: مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۵۰۲۲۔

۳۔ مسند احمد، رقم ۸۹۵۰۔

— ۵ —

عَنْ أَوْسَطَ بْنِ إِسْمَاعِيلَ الْبَجَلِيِّ، أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا بَكْرٍ[1] حِيْنَ قُبِضَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ مَقَامِيْ هٰذَا عَامَ الْأَوَّلِ، ثُمَّ بَكَى أَبُوْ بَكْرٍ، ثُمَّ قَالَ: "عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ فَإِنَّهُ مَعَ الْبِرِّ، وَهُمَا فِي الْجَنَّةِ، وَإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ فَإِنَّهُ مَعَ الْفُجُوْرِ، وَهُمَا فِي النَّارِ، وَسَلُوا اللّٰهَ الْمُعَافَاةَ، فَإِنَّهُ لَمْ يُؤْتَ أَحَدٌ بَعْدَ الْيَقِيْنِ خَيْرًا مِنَ الْمُعَافَاةِ، وَلَا تَحَاسَدُوْا، وَلَا تَبَاغَضُوْا، وَلَا تَقَاطَعُوْا، وَلَا تَدَابَرُوْا، وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ إِخْوَانًا [كَمَا أَمَرَكُمُ اللّٰهُ][2]۔

اوسط بن اسمٰعیل بجلی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہو گئے تو اُنھوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پچھلے سال اِسی جگہ کھڑے تھے، پھر وہ (آپ کو یاد کر کے) رونے لگے، پھر کہا: آپ نے فرمایا تھا: تم اپنے لیے سچائی کو لازم کرلو، کیونکہ سچائی نیکی کے ساتھ ہے، اور یہ دونوں جنت میں ہوں گی۔ اور تم جھوٹ سے پرہیز کرو، کیونکہ جھوٹ برائی کے ساتھ ہے، اور یہ دونوں دوزخ میں ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ سے عافیت چاہو، اِس لیے کہ ایمان و

یقین کے بعد کوئی چیز عافیت سے بڑھ کر نہیں ہے۔ تم آپس میں ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، بغض نہ رکھو، قطع تعلق نہ کرو اور باہم دشمنی نہ کرو، بلکہ اللہ کے بندے بھائی بھائی بن کر رہو، جیسا کہ اللہ نے تمھیں ہدایت فرمائی ہے[1]۔

۱۔ یعنی قرآن مجید میں، جسے قرآن کا ہر طالب علم جگہ جگہ دیکھ سکتا ہے۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن سنن ابن ماجہ، رقم ۳۸۴۷ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے راوی ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ اُن سے یہ روایت درج ذیل مصادر میں نقل ہوئی ہے:

مسند ابوداؤد طیالسی، رقم ۴۔ مسند حمیدی، رقم ۷۔ مسند ابن جعد، رقم ۱۴۵۷۔ مسند احمد، رقم ۱۷۔ الادب المفرد، رقم ۷۲۳۔ التاریخ الکبیر، بخاری، رقم ۲۸۷۔ مسند بزار، رقم ۵۸۔ مسند ابی یعلیٰ، رقم ۱۱۶۔ مشکل الآثار، طحاوی ۳۹۱۔ صحیح ابن حبان، رقم ۵۸۵۲۔

۲۔ مسند بزار، رقم ۱۱۴۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

المصادر والمراجع

ابن حبان، أبو حاتم بن حبان. (١٤١٤هـ/١٩٩٣م). **صحيح ابن حبان**. ط٢. تحقيق: شعيب الأرنؤوط. بيروت: مؤسسة الرسالة.

ابن حجر، على بن حجر أبو الفضل العسقلاني. (١٣٧٩هـ). **فتح الباري شرح صحيح البخاري**. (د.ط). تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي. بيروت: دار المعرفة.

ابن قانع. (١٤٨١هـ/١٩٩٨م). **المعجم الصحابة**. ط١. تحقيق:حمدي محمد. مكة مكرمة: نزار مصطفٰى الباز.

ابن ماجة، ابن ماجة القزويني. (د.ت). **سنن ابن ماجة**. ط١. تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي. بيروت: دار الفكر.

ابن منظور، محمد بن مكرم بن الأفريقي. (د.ت). **لسان العرب**. ط١. بيروت: دار صادر.

أبو نعيم ، (د.ت). **معرفة الصحابه**. ط١ . تحقيق: مسعد السعدني. بيروت: دارالكتاب العلمية.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (د.ت). **مسند أحمد بن حنبل**. ط١ . بيروت: دار إحياء التراث العربي.

البخاري، محمد بن إسماعيل. (١٤٠٧هـ/ ١٩٨٧م). **الجامع الصحيح**. ط٣ . تحقيق: مصطفٰى ديب البغا. بيروت: دار ابن كثير.

بدر الدين العيني. **عمدة القاري شرح صحيح البخاري**. (د.ط). بيروت: دار إحياء التراث العربي.

البيهقي، أحمد بن الحسين البيهقي. (١٤١٤هـ/١٩٩٤م). **السنن الكبرٰى**. ط١ . تحقيق: محمد عبد القادر عطاء. مكة المكرمة: مكتبة دار الباز.

السيوطي، جلال الدين السيوطي. (١٤١٦هـ/ ١٩٩٦م). **الديباج على صحيح مسلم بن الحجاج**. ط ١ . تحقيق: أبو إسحٰق الحويني الأثري. السعودية: دار ابن عفان للنشر والتوزيع.

الشاشي، الهيثم بن كليب. (١٤١٠هـ). **مسند الشاشي**. ط١ . تحقيق: محفوظ الرحمٰن زين اللّٰه. المدينة المنورة: مكتبة العلوم والحكم.

محمد القضاعي الكلبي المزي. (١٤٠٠هـ/١٩٨٠م). **تهذيب الكمال في أسماء الرجال**. ط١ . تحقيق: بشار عواد معروف. بيروت: مؤسسة الرسالة.

مسلم، مسلم بن الحجاج. (د.ت). **صحيح المسلم**. ط١ . تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

النسائي، أحمد بن شعيب. (١٤٠٦هـ/١٩٨٦م). **السنن الصغرٰى**. ط٢ . تحقيق: عبد الفتاح أبو غدة. حلب: مكتب المطبوعات الإسلامية.

النسائي، أحمد بن شعيب. (١٤١١هـ/١٩٩١م). **السنن الكبرٰى**. ط١ . تحقيق: عبد الغفار سليمان البنداري، سيد كسروي حسن. بيروت: دار الكتب العلمية.

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سیر و سوانح

محمد وسیم اختر مفتی

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا

(۱۰)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی'، ''نمازوں کی پابندی کرو خصوصاً بیچ کی نماز کی'' (البقرہ ۲: ۲۳۸)۔ 'اَلصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی' کی تفسیر میں کچھ اختلاف ہے، تاہم حضرت عائشہ فرماتی ہیں: اس سے مراد عصر کی نماز ہے۔ انھیں اپنی تفسیر کے صحیح ہونے پر اس قدر اعتماد تھا کہ اپنے مصحف کے حاشیہ پر اسے لکھوا دیا تھا (مسلم، رقم ۱۴۲۷۔ ابوداؤد، رقم ۴۱۰۔ ترمذی، رقم ۲۹۸۲۔ نسائی، رقم ۴۷۳۔ مسند احمد، رقم ۲۵۴۵۰)۔ ان معنوں کی تائید ان بے شمار روایتوں سے ہوتی ہے جو حضرت علی سے مروی ہیں، جنگ احزاب کے دن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کو بددعا دی، اللہ ان کی قبروں اور ان کے گھروں کو آگ سے بھر دے، کیونکہ انھوں نے ہمیں صلاۃ وسطیٰ (نماز عصر) پڑھنے سے روک دیا، حتیٰ کہ سورج غروب ہو گیا (بخاری، رقم ۲۹۳۱۔ مسلم، رقم ۱۳۶۵)۔

اہل ایمان نے خشک سالی کی شکایت کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر سے باہر نکل کر نماز استسقا ادا کرنے کے لیے ایک دن مقرر کر دیا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: سورج کا ایک کنارہ ہی طلوع ہوا تھا کہ آپ منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ تکبیر و تحمید کے بعد فرمایا: تم نے اپنے ملک میں سوکھا پڑنے اور وقت پر بارش نہ ہونے کی شکایت کی ہے۔ اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ اس سے دعا کرو اور وعدہ کرتا ہے کہ دعا قبول کرے گا۔ آپ نے ہاتھ اٹھا کر بارش کی دعا کی پھر

منبر سے اترے اور دو رکعتیں پڑھائیں۔ آخر کار اللہ نے بادل بھیجا جو کڑکا اور برسا۔ آپ اپنی مسجد تک نہ پہنچے تھے کہ ندی نالے بہنے شروع ہو گئے (ابوداؤد، رقم ۱۱۷۳۔ مستدرک حاکم، رقم ۱۲۲۵)۔

روزہ

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: زمانۂ جاہلیت میں قریش یوم عاشورا (دس محرم) کا روزہ رکھتے تھے۔ مدینہ ہجرت کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دن روزہ خود بھی رکھتے اور اہل ایمان کو بھی روزہ سے رہنے کا حکم دیتے۔ جب ماہ رمضان کے روزے فرض ہوئے تو آپ نے ارشاد فرمایا: عاشورا اللہ کے دنوں میں سے ایک دن ہے، جس کا جی چاہتا ہو، یہ روزہ رکھ لے اور جو نہ چاہے، نہ رکھے (مسلم، رقم ۲۶۰۷۔ ابوداؤد، رقم ۲۴۴۲۔ ترمذی، رقم ۷۵۳۔ ابن ماجہ، رقم ۱۷۳۷۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۰۱۱)۔ یہودی یوم عاشورا کو مقدس جانتے تھے، کیونکہ اس دن اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو فرعون پر غلبہ عطا کیا تھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگلے برس ہم نویں محرم کا روزہ رکھیں گے، لیکن اس سے پہلے آپ کی وفات ہو گئی (مسلم، رقم ۲۶۳۶۔ ابن ماجہ، رقم ۱۷۳۶)۔ ایک روایت کے مطابق آپ نے فرمایا: نویں، دسویں محرم دونوں دنوں کا روزہ رکھو اور یہود کی مخالفت کرو (ترمذی، رقم ۷۵۵)۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: رمضان کا آخری عشرہ آتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنا تہ بند مضبوطی سے باندھ لیتے، راتوں کو خود بھی جاگتے اور اپنی ازواج کو بھی بیدار رکھتے (بخاری، رقم ۲۰۲۴۔ مسلم، رقم ۲۷۵۷۔ نسائی، رقم ۱۶۴۰۔ ابن ماجہ، رقم ۱۷۶۸۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۵۱۳۶)۔ تہ بند مضبوطی سے باندھ لینا کنایہ ہے، ازواج سے الگ رہتے ہوئے عبادت پر پوری توجہ مرکوز کرنا۔

حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک بار ماہ رمضان میں) مسجد میں نماز (تراویح) ادا کی۔ صحابہ نے بھی آپ کی اقتدا کی۔ دوسری رات آپ نے نماز پڑھی تو بہت لوگ اکٹھے ہو گئے۔ آپ نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا: اتنے اعمال کرو جو تمھارے بس میں ہوں۔ اللہ تو نہ تھکے گا، لیکن تم بے زار ہو جاؤ گے۔ تیسری (یا چوتھی) رات صحابہ جمع ہو کر آپ کے آنے کا انتظار کرتے رہے، لیکن آپ نہ آئے۔ اگلے دن فرمایا: اس اندیشے نے کہ یہ نماز تم پر فرض نہ ہو جائے، مجھے باہر نکلنے سے روکے رکھا (ابوداؤد، رقم ۱۳۷۳۔ نسائی، رقم ۱۶۰۵۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۳۲۲)۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: میرے علم میں نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ایک رات میں مکمل قرآن تلاوت کیا ہو، پوری رات، فجر تک قیام کیا ہو یا رمضان کے علاوہ مہینے بھر کے روزے رکھے ہوں (نسائی، رقم ۱۶۴۲)۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اعتکاف صرف روزہ رکھنے پر ہو گا (موطا امام مالک، رقم ۱۱۲۱۔ مستدرک حاکم، رقم ۱۶۰۵)۔

حضرت عائشہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: اگر میں لیلۃ القدر کو پا لوں تو کیا دعا مانگوں؟ جواب فرمایا:'اللّٰھم إنك عفو تحب العفو فاعف عني'،''اے اللہ، تو بہت معاف کرنے والا ہے، معافی دینا پسند کرتا ہے، مجھ سے بھی درگذر کر لے''(ترمذی، رقم ۳۵۱۳۔ ابن ماجہ، رقم ۳۸۵۰۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۵۳۸۴۔ مستدرک حاکم، رقم ۱۹۴۲)۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ انھوں نے کبھی نہیں دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی الحجہ کے (پہلے) دس دنوں میں روزہ رکھا ہو (ترمذی، رقم ۷۵۶۔ ابن ماجہ، رقم ۱۷۲۹۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۱۴۷)۔ امام طحاوی نے حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نقل کیا: ''اللہ کے ہاں اس سے زیادہ پاکیزہ اور زیادہ مرتبہ رکھنے والا عمل کوئی نہیں جو عید الاضحیٰ کے (پہلے) دس دنوں میں کیا جائے'' (بخاری، رقم ۹۶۹)۔ اور سوال اٹھایا کہ آپ نے ان ایام میں روزہ رکھنا کیوں نہیں پسند فرمایا؟ پھر خود ہی اس کا یہ جواب دیا کہ روزہ رکھنے کے بعد انسان ذکر اور تلاوت جیسے اشغال کی ہمت نہیں پاتا۔ انھوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود کا قول بیان کیا کہ جب میں روزہ رکھتا ہوں تو نوافل پڑھنے میں سستی کرتا ہوں (شرح مشکل الآثار: باب ۴۶۷)۔ یہ جواب تسلی بخش نہیں، کیونکہ ہر نفلی روزے میں ایسا ہی ہوتا ہے تو کیا اہل ایمان روزہ رکھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ عبدالرحمٰن مبارک پوری کہتے ہیں: ان ایام میں روزہ رکھنا مکروہ نہیں۔ یوم عرفہ (۹ رذی الحجہ) انھی ایام میں سے ایک ہے، اس روز کا روزہ تو مستحب ہے۔ ہو سکتا ہے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عارضے یا سفر کے سبب روزہ نہ رکھا ہو۔ ابن حجر کا کہنا ہے: حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت میں جن نیک اعمال کی ترغیب دی گئی ہے، روزہ ان میں شامل ہے۔ اس بات کا احتمال ہے کہ آپ نے روزہ اس لیے چھوڑا ہو کہ کہیں امت پر فرض نہ ہو جائے۔

حضرت عائشہ کو بتایا گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ایک روزہ جلد کھولتے ہیں اور نماز بھی ترت ادا کر لیتے ہیں۔ دوسرے صاحب افطار اور نماز، دونوں میں تاخیر کرتے ہیں۔ پوچھا: افطاری اور نماز میں عجلت کرنے والے کون ہیں؟ بتایا گیا: عبداللہ بن مسعود۔ حضرت عائشہ نے فرمایا: آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا کیا کرتے

تھے۔تاخیر کرنے والے حضرت ابوموسیٰ اشعری تھے (ابوداؤد، رقم ۲۳۵۴۔نسائی، رقم ۲۱۶۰۔موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۲۱۲)۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آتے تو کھانے کا پوچھتے۔جب ہم کہتے: کھانے کو کچھ نہیں،تو آپ روزے کی نیت فرما لیتے۔ایک بار تشریف لائے تو ہم نے کہا: (کھجور، پنیر اور گھی سے بنے ہوئے حلوے) حیس کا تحفہ آیا پڑا ہے،آپ کی خاطر رکھا ہوا ہے۔فرمایا: لاؤ، پھر حیس تناول کر کے نفلی روزہ افطار کر لیا اور فرمایا: نفلی روزہ صدقے کی طرح ہوتا ہے۔آدمی اپنے مال سے صدقہ نکالتا ہے، پھر اس کا جی چاہتا ہے تو دے دیتا ہے،نہیں چاہتا تو پاس رکھ لیتا ہے (ابوداؤد، رقم ۲۴۵۵۔ترمذی، رقم ۷۳۴۔نسائی، رقم ۲۳۲۴۔ابن ماجہ، رقم ۱۷۰۱۔موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۵۷۳۱)۔حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ کے پاس کہیں سے کھانا آیا تو انھوں نے نفلی روزہ کھول دیا۔مسئلہ آپ کے سامنے پیش ہوا تو فرمایا: کوئی حرج نہیں،اس کے بدلے اور روزہ رکھ لینا (ابوداؤد، رقم ۲۴۵۷۔ترمذی، رقم ۷۳۵۔موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۶۲۶۷)۔سیوطی کا کہنا ہے: نفلی روزہ بغیر عذر کے بھی کھولا جا سکتا ہے، البتہ زیادہ تر علما اس کی قضا ضروری قرار دیتے ہیں۔بلا وجہ نفلی روزہ توڑنے کے خلاف اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے: ’یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَکُمْ‘ ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی تابع فرمانی کرو اور اپنے اعمال کو اکارت نہ کرو“ (محمد ۴۷: ۳۳)۔ابن منیر کہتے ہیں: یہ ایک عام حکم ہے، اگر کسی خاص معاملے میں الگ نص وارد ہوئی ہو تو اسے حکم عام پر ترجیح دی جاتی ہے۔ابن عبدالبر کا کہنا ہے: اس آیت سے استدلال ہی درست نہیں، کیونکہ اس کے معنی ہیں، اپنے اعمال میں اخلاص پیدا کرو، ریاکاری اور کبائر سے انھیں برباد نہ کرو (نیل الاوطار، باب ان صوم تطوع لا یلزم بالشروع، شوکانی)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حج و عمرہ

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یا رسول اللہ، ہم (عورتیں) آپ کے ساتھ غزوہ و جہاد نہ کریں، کیونکہ میں نے قرآن مجید میں جہاد سے افضل کوئی عمل نہیں پایا؟ فرمایا: نہ، (تمھارے لیے) بہترین اور عمدہ ترین جہاد حج مبرور ہے۔حضرت عائشہ نے کہا: میں یہ فرمان نبوی سننے کے بعد حج نہ چھوڑوں گی (بخاری، رقم ۱۸۶۱۔نسائی، رقم ۲۶۲۹۔ابن ماجہ، رقم ۲۹۰۱۔موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۴۹۷)۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ احرام باندھے ہوئے سفر کر رہے تھے۔جب کوئی

مسافر ہمارے پاس سے گزرتا تو ہم اپنے آنچل سروں سے لٹکا (کر منہ ڈھانپ) لیتے اور جب وہ آگے بڑھ جاتا تو ہم ان کو اونچا کر دیتے (ابوداؤد، رقم ۱۸۳۳۔ ابن ماجہ، رقم ۲۹۳۵۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۰۲۱)۔ اس حدیث کے راوی یزید بن ابوزیاد کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ بڑھاپے میں ان کا حافظہ جاتا رہا تھا۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس سے نکلے تو خوش دل تھے، آپ کا اطمینان آنکھوں سے چھلک رہا تھا، لیکن جب لوٹے تو مغموم تھے۔ میں نے سبب پوچھا تو فرمایا: میں کعبے کے اندر سے ہو کر آیا ہوں۔ اب چاہ رہا ہوں کہ ایسا نہ کیا ہوتا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میں نے اپنے بعد آنے والی امت کو مشقت میں ڈال دیا ہے (ابوداؤد، رقم ۲۰۲۹۔ ترمذی، رقم ۸۷۳۔ ابن ماجہ، رقم ۳۰۶۴۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۵۰۵۶)۔ یعنی ہر ایک کے لیے بیت اللہ میں داخل ہونا اور نوافل پڑھنا ممکن نہ ہوگا۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: میں بیت اللہ کے اندر جا کر نماز پڑھنا چاہتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا اور حطیم میں لا کھڑا کیا۔ فرمایا: جب تو کعبہ کے اندر جانا چاہے تو حطیم میں نماز پڑھ لیا کرو، یہ کعبہ ہی کا ایک قطعہ ہے (ابوداؤد، رقم ۲۰۲۸۔ نسائی، رقم ۲۹۱۵)۔ دوسری روایت میں ہے کہ انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ، میرے علاوہ آپ کی تمام ازواج بیت اللہ میں داخل ہو چکی ہیں۔ آپ نے فرمایا: کلید بردار کعبہ شیبہ عبدری کو پیغام بھیجو، وہ تمھیں دروازہ کھول دے۔ حضرت شیبہ نے جواب دیا: جاہلیت میں نہ اسلام میں ہم رات کے وقت کعبہ کا دروازہ کھولتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: تم حطیم میں نوافل ادا کر لو (موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۳۸۴)۔

سیدہ عائشہ فرماتی ہیں: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا: کیا حطیم کعبہ کا حصہ ہے؟ فرمایا: ہاں۔ میں نے پوچھا: پھر لوگوں نے اسے بیت اللہ کے اندر شامل کیوں نہیں کیا؟ جواب فرمایا: تیری قوم قریش کے پاس خرچہ ختم ہو چکا تھا اس لیے حطیم باہر رہ گیا۔ میں نے اگلا سوال کیا: اللہ کے گھر کا دروازہ اونچا کیوں ہے؟ فرمایا: تمھاری قوم نے اسے اونچا اس لیے رکھا کہ جسے چاہیں کعبہ کے اندر بھیج دیں اور جسے چاہیں، روک لیں۔ تمھاری قوم کا زمانۂ جاہلیت حال ہی میں نہ گزرا ہوتا اور مجھے ان کے (دوبارہ) کافر ہو جانے کا خدشہ نہ ہوتا تو میں حطیم کی (پانچ یا) چھ ہاتھ جگہ کعبہ میں شامل کر دیتا اور بیت اللہ کے شرقی و غربی دو دروازے بنا کر انھیں زمین کے برابر کر دیتا (بخاری، رقم ۱۵۸۴۔ مسلم، رقم ۳۲۲۳۔ نسائی، رقم ۲۹۰۴۔ ابن ماجہ، رقم ۲۹۵۵۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۷۰۹)۔

۶۰ھ میں حضرت عبداللہ بن زبیر نے مکہ، جنوبی عرب، عراق، شام اور مصر کے علاقوں پر اپنی خلافت قائم کی تو حضرت عائشہ کی روایت کے مطابق بیت اللہ کی از سر نو تعمیر کی۔ بارہ سال حکومت کرنے کے بعد اموی حکمران

عبدالملک بن مروان نے انھیں شہید کروایا تو کعبہ کو قریش کے نقشے پر واپس لوٹا دیا۔طواف کرتے ہوئے اس نے حضرت عائشہ کی روایت کو حضرت عبداللہ بن زبیر کا گھڑا ہوا جھوٹ قرار دیا تو حارث بن عبداللہ نے تردید کی کہ میں نے یہ فرمان نبوی خود حضرت عائشہ سے سن رکھا ہے۔تب عبدالملک نے کہا: اگر میں یہ فرمان پہلے سن لیتا تو عبداللہ بن زبیر کی تعمیر کو مسمار نہ کرتا (موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۶۱۵۱)۔

حضرت عائشہ کے بھانجے، مشہور تابعی عروہ بن زبیر نے ان سے سوال کیا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: 'اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا'، ''بے شک صفا اور مروہ اللہ کے شعائر (خاص نشانیوں) میں سے ہیں تو جو کوئی بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے، اس پر کوئی حرج نہیں کہ ان کے مابین چکر لگائے'' (البقرہ ۲: ۱۵۸)۔ مجھے اس کا مطلب یہ لگتا ہے کہ جو صفا و مروہ کے درمیان سعی نہ کرے، اس پر بھی کچھ گناہ نہ ہوگا۔حضرت عائشہ نے فرمایا: ہرگز نہیں، اس شخص کا حج و عمرہ مکمل نہیں ہوتا جس نے صفا و مروہ کے درمیان سعی نہ کی ہو۔اگر تمھاری بات سچ ہوتی تو آیت اس طرح ہوتی: 'فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ لَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا '۔اصل میں یہ آیت انصار مدینہ کے بارے میں نازل ہوئی جو کہتے تھے کہ ہمیں بیت اللہ کے طواف کا حکم ہوا ہے، صفا و مروہ کا نہیں۔اہل جاہلیت مکہ کے قریبی مقام قدید کی چوٹی مشلل پر پڑے منات بت کا نام لے کر احرام باندھتے اور صفا و مروہ کے درمیان سعی نہ کرتے۔کچھ عربوں کا خیال تھا کہ سعی بین الصفا والمروہ جاہلیت کی نشانی ہے، کیونکہ ان کے پاس اساف و نائلہ نامی بت پڑے تھے۔قبول اسلام کے بعد وہ سعی کرنے سے ہچکچاتے تھے، ان کا اشکال دور کرنے کے لیے اس ارشاد کا نزول ہوا (بخاری، رقم ۱۷۹۰۔ مسلم، رقم ۳۰۵۵۔ ابوداؤد، رقم ۱۹۰۱۔ ترمذی، رقم ۲۹۶۵۔ نسائی، رقم ۲۹۷۱۔ ابن ماجہ، رقم ۲۹۸۶۔ مستدرک حاکم، رقم ۳۰۶۹)۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: شیطانوں کو کنکریاں مارنا، بیت اللہ کا طواف کرنا اور صفا و مروہ کے مابین سعی کرنا، یہ اعمال اللہ ہی کا ذکر بلند کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔غیر اللہ کا ذکر مطلوب نہیں ہوتا (ترمذی، رقم ۹۰۲۔ مستدرک حاکم، رقم ۱۶۸۵)۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: قریش، بنو کنانہ اور بنو جدیلہ دین جاہلی میں متشدد تھے۔حج کے دن یہ مزدلفہ میں قیام کرتے تھے، جب کہ باقی تمام قبائل کا وقوف عرفات میں ہوتا تھا۔آمد اسلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ ۹؍ ذی الحجہ کو عرفات میں وقوف کریں اور پھر مزدلفہ کو لوٹیں۔اللہ کا ارشاد: 'ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ'، ''پھر جہاں سے سب پلٹتے ہیں، تم بھی وہیں سے واپس لوٹو'' (البقرہ ۲: ۱۹۹) اسی کا بیان ہے (مسلم، رقم ۲۹۲۶۔

ابوداؤد، رقم ۱۹۱۰۔ نسائی، رقم ۳۰۱۵)۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: میں نے چاہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے لوں کہ مزدلفہ سے رات کے وقت ہی منیٰ کے لیے نکل جاؤں، فجر کی نماز منیٰ میں پڑھوں اور حاجیوں کے وہاں پہنچنے سے پہلے رمی کر لوں (لیکن آپ نے اجازت نہ دی)۔ آپ حضرت سودہ کو یہ سہولت عطا فرما چکے تھے، کیونکہ وہ بھاری بھرکم ہونے کی وجہ سے چست نہ تھیں (نسائی، رقم ۳۰۵۲۔ ابن ماجہ، رقم ۳۰۲۷۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۰۱۵)۔

حضرت عائشہ نے کہا: یا رسول اللہ، ہم آپ کے لیے منیٰ میں ایک گھر کیوں نہ بنا دیں جو آپ کو دھوپ سے سایہ فراہم کرے؟ فرمایا: (یہ تو عارضی قیام گاہ ہے) کوئی بھی پہلے پہنچ کر اونٹ بٹھائے اور قیام کرے (ابوداؤد، رقم ۲۰۱۹۔ ترمذی، رقم ۸۸۱۔ ابن ماجہ، رقم ۳۰۰۶۔ مستدرک حاکم، رقم ۱۷۱۴)۔

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں: آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کو ذوالحجہ کے مہینے میں عمرہ کرنے کو اس لیے کہا کہ مشرکین قریش اور ان کے ہم مذہب اس ماہ میں عمرہ کرنا حرام سمجھتے تھے۔ آپ نے ان کے اس عقیدے کو باطل قرار دیا کہ جب حج کی سواری کے جانوروں کے بال بڑھ جائیں، ان کے پشت کے زخم صحیح ہو جائیں اور صفر کا مہینا شروع ہو جائے تو عمرہ جائز ہوگا (ابوداؤد، رقم ۱۹۸۷۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۳۶۱)۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: جب تم میں سے کوئی حج کر لے تو سواری کا رخ اپنے اہل خانہ کی طرف موڑ دے، کیونکہ یہ اس کے اجر کو بہت بڑھا دے گا (السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۰۳۶۳۔ مستدرک حاکم، رقم ۱۷۵۳)۔

نکاح و طلاق

ارشاد باری تعالیٰ ہے: 'وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی فَانۡکِحُوۡا مَا طَابَ لَکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ'، ''اور اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے معاملے میں انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں تمھیں پسند آئیں، ان میں سے دو دو تین تین چار چار سے نکاح کر لو' (النساء ۴:۳)۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: یہ آیت اس یتیم لڑکی کے باب میں نازل ہوئی جو اپنے ولیٔ رشتہ دار کی پرورش میں ہو اور ترکے میں اس کی ساجھی ہو۔ وہ اسے ناپسند کرتا ہو، لیکن یہ بھی نہ چاہتا ہو کہ کوئی اور اس سے نکاح کر کے اس کا مال لے اڑے۔ اسے اس سے نکاح کرنے سے منع کر دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ اس کے علاوہ اپنی پسند کی عورتوں سے شادی کر لے۔ ہاں اگر اس کے مرتبے کے مطابق انصاف سے مہر دے اور حسن معاشرت کا ارادہ رکھے تو اس سے نکاح کی اجازت ہے (بخاری، رقم ۲۴۹۴۔

مسلم، رقم ۶۳۴۴۔ ابوداؤد، رقم ۲۰۶۸۔ نسائی، رقم ۳۳۴۸)۔

سیدہ عائشہ فرماتی ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: جس لڑکی کا گھر والے بیاہ کرنا چاہتے ہوں، آیا وہ اس سے مشورہ لیں گے؟ فرمایا: ہاں بالکل۔ میں نے کہا: ایسی بچی تو شرما رہی ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا: اس کی خاموشی ہی اس کی طرف سے اجازت ہوگی (بخاری، رقم ۶۹۴۶۔ مسلم، رقم ۳۴۵۹۔ ابوداؤد، رقم ۲۰۹۴۔ نسائی، رقم ۳۲۶۹۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۱۸۵)۔

فرمان باری تعالیٰ ہے: 'اِنِ امۡرَاَةٌ خَافَتۡ مِنۡۢ بَعۡلِهَا نُشُوۡزًا اَوۡ اِعۡرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَاۤ اَنۡ يُّصۡلِحَا بَيۡنَهُمَا صُلۡحًا وَالصُّلۡحُ خَيۡرٌ'؛ ''اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رخی کا اندیشہ ہو تو اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں آپس میں کوئی سمجھوتا کر لیں اور سمجھوتا ہی بہتر ہے'' (النساء ۴: ۱۲۸)۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: یہ فرمان اس مرد کے بارے میں ہے جسے بڑھاپے یا کسی اور سبب سے اسے اپنی بیوی سے رغبت نہیں رہتی اور وہ اسے چھوڑ کر دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ بیوی اس سے کہہ سکتی ہے کہ مجھے اپنے پاس رہنے دے اور میرا نفقہ (یا مہر) جیسے چاہو، دیتے رہنا۔ اس طرح دونوں راضی ہو جائیں تو کوئی مضایقہ نہیں (بخاری، رقم ۲۶۹۴۔ مسلم، رقم ۷۶۴۰۔ مستدرک حاکم، رقم ۲۳۵۲)۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: زمانۂ جاہلیت میں شوہر اپنی بیوی کو جتنی چاہے طلاقیں دیتا، وہ اس کی بیوی رہتی اگر عدت کے اندر اس سے رجوع کر لیتا۔ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا: بخدا! میں نہ تمھیں طلاق دوں گا کہ تو مجھ سے جدا ہو جائے، نہ اپنے پاس بساؤں گا۔ میں طلاق دوں گا اور جب عدت پوری ہونے لگے گی تو رجوع کر لوں گا۔ اس عورت نے حضرت عائشہ کو اپنی بپتا سنائی تو وہ خاموش ہو گئیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر کی۔ آپ نے بھی سکوت فرمایا، حتیٰ کہ وحی نازل ہوئی: 'اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ'؛ ''طلاق دو بار ہے، پھر معروف طریقے سے روک لینا ہے یا احسان کر کے رخصت کر دینا''۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں: لوگوں نے طلاق کو واقع ہوتا دیکھ کر رویہ بدلا، اس نے جو طلاق دینا چاہتا تھا اور اس نے بھی جو نہ دینا چاہتا تھا (ترمذی، رقم ۱۱۹۲۔ مستدرک حاکم، رقم ۳۱۰۶)۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: شکر ہے اس اللہ کا جس کی سماعت آوازیں سننے کی وسعت رکھتی ہے، جب اوس بن صامت کی اہلیہ خولہ بنت ثعلبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے خاوند کی شکایت کرنے آئیں تو میں گھر کے کونے میں ان کی باتیں سن رہی تھی۔ مجھے کچھ باتیں سمجھ آئیں اور کچھ کا پتا نہ چلا۔ انھوں نے کہا: یا رسول اللہ، اوس نے میرا مال

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

صرف کر ڈالا، میری جوانی غارت کر دی۔ اب میں عمر رسیدہ ہو گئی ہوں، اولاد کا سلسلہ بند ہو گیا ہے تو مجھ سے ظہار کر دیا ہے، (یعنی اپنی ماں سے تشبیہ دے کر اپنے اوپر حرام کر دیا ہے) اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے کفارۂ ظہار کا حکم (المجادلہ ۵۸: ۱) نازل کیا اور واضح کیا کہ بیوی کو ماں کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی، جیسا کہ جہلاے عرب کا دستور تھا، البتہ مرد کو یہ لغو بات کہنے کی سزا بھگتنا ہو گی، وہ ایک غلام آزاد کرے گا یا دو مہینے کے لگا تار روزے رکھے گا یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے گا، تبھی اپنی عورت کے پاس جا سکے گا (ابن ماجہ، رقم ۱۸۸۱۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۱۹۵۔ مستدرک حاکم، رقم ۳۷۹۱)۔

یحییٰ بن سعید نے عبدالرحمٰن بن حکم کی بیٹی عمرہ کو طلاق دی تو عبدالرحمٰن اسے گھر لے گئے۔ حضرت عائشہ نے گورنر مدینہ مروان بن حکم کو پیغام بھیجا کہ اللہ سے ڈرو اور بچی کو عدت گزارنے کے لیے اس کے شوہر کے گھر واپس بھیج دو جہاں اسے طلاق ہوئی تھی۔ مروان نے کہا: مجھے عبدالرحمٰن بن حکم نے مجبور کر دیا تھا، میں اسے روک نہ سکا۔ اس نے حضرت فاطمہ بنت قیس کی طلاق کا حوالہ بھی دیا جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن ام مکتوم کے گھر میں عدت گزارنے کی اجازت دے دی تھی۔ حضرت عائشہ نے جواب دیا: اس اجازت کی خاص وجہ تھی کہ فاطمہ کے شوہر کا گھر ویران جگہ پر تھا اور ان کا اپنے سسرال والوں سے جھگڑا رہتا تھا۔ مروان نے کہا: یہاں بھی میاں بیوی میں باہم جھگڑا رہتا تھا، اس لیے بیوی نے خاوند کا گھر چھوڑ دیا (بخاری، رقم ۵۳۲۱۔ ابوداؤد، رقم ۲۲۹۵۔ نسائی، رقم ۳۵۷۵۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۷۳۴۱)۔ عینی کہتے ہیں: حضرت عمر اور حضرت عائشہ حضرت فاطمہ بنت قیس کی روایت پر عمل درست نہ سمجھتے تھے، وہ اللہ کے اس فرمان کو ملحوظ خاطر رکھتے تھے: 'يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ'، ''اے نبی، تم لوگ جب بیویوں کو طلاق دو تو ان کی عدت کے حساب سے طلاق دو اور عدت کا صحیح شمار رکھو، اللہ اپنے رب سے ڈرتے رہو۔ ان کو گھروں سے نہ نکالو، نہ وہ خود ہی نکلیں، الّا یہ کہ انھوں نے کھلی بدکاری کا ارتکاب کیا ہو'' (الطلاق ۶۵: ۱)۔ (نسائی، رقم ۳۵۷۹)۔

سعد بن ہشام نے سیدہ عائشہ سے کہا: میں تجرد (چھڑا پن، celibacy) کے بارے میں آپ کی راے دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے جواب دیا، غیر متاہل زندگی اختیار نہ کرنا۔ تم نے اللہ کا ارشاد نہیں سنا: 'وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً'، ''اے نبی، ہم نے آپ سے پہلے بھی کئی رسول بھیجے اور انھیں بیویوں اور اولاد سے نوازا (الرعد ۱۳: ۳۸)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی شادیاں کیں اور آپ کی

اولاد ہوئی (نسائی، رقم ۳۲۱۸۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۸۱۰)۔

زہد و ورع

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم آسمان کو ابر آلود دیکھتے تو (گھبرا کر) آگے پیچھے، اندر باہر ہوتے اور آپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا۔ بارش شروع ہوتی تو آپ کی گھبراہٹ زائل ہو جاتی۔ میں نے پوچھا: بادل آئیں تو لوگ بارش کی امید میں خوش ہوتے ہیں، جب کہ آپ کے چہرے پر ناخوش گواری نظر آتی ہے۔ فرمایا: مجھے ڈر ہوتا ہے، ان بادلوں میں سے عذاب نمودار نہ ہو جائے، جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر آیا۔ انھوں نے بھی کہا تھا: 'هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا'، ''یہ بادل ہم پر بارش برسانے آیا ہے'' (الاحقاف ۴۶: ۲۴)، (بخاری، رقم ۳۲۰۶۔ ابوداؤد، رقم ۵۰۹۸۔ ترمذی، رقم ۳۲۵۷۔ ابن ماجہ، رقم ۳۸۹۱۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۳۶۹۔ مستدرک حاکم، رقم ۳۷۰۰)۔ حضرت عائشہ بتاتی ہیں: جب آپ افق میں بادل اٹھتا ہوا دیکھتے تو تمام عمل، حتیٰ کہ نماز بھی چھوڑ دیتے اور دعا فرماتے: 'اللّٰهم إني أعوذ بك من شرها'، اے اللہ، میں اس ابر کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ اگر بارش ہو جاتی تو فرماتے: اللہ، خوب برسا خوش گوار بارش (ابوداؤد، رقم ۵۰۹۹۔ نسائی، رقم ۱۵۲۴۔ ابن ماجہ، رقم ۳۸۸۹۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۵۹۰)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کو تلقین کی کہ کامل اور جامع دعائیں اپنا وظیفہ بنا لو۔ ان میں سے ایک یہ تھی: 'اللّٰهم إني أسألك من الخير كله عاجله و آجله ما علمت منه و ما لا أعلم. و أعوذ بك من الشر كله عاجله و آجله ما علمت منه و ما لا أعلم. و أسألك الجنة و ما قرب إليها من قول أو عمل. و أعوذ بك من النار و ما قرب إليها من قول أو عمل. و أسألك من الخير ما سألك عبدك و رسولك محمد. و أستعيذ مما استعاذك منه عبدك و رسولك محمد و أسألك ما قضيت لي من أمر أن تجعل عاقبته رشدًا'، ''اے اللہ، میں تم سے خیر کا سوال کرتا ہوں، ہر طرح کی خیر، جلد ملنے والی اور دیر سے حاصل ہونے والی، جو میں جانتا ہوں اور جو میرے علم میں نہیں۔ میں شر سے تمھاری پناہ چاہتا ہوں، ہر قسم کا شر، جلد لاحق ہونے والا اور دیر سے وارد ہونے والا، جو میں جانتا ہوں اور جو میرے علم میں نہیں۔ میں تم سے وہ خیر مانگتا ہوں جو تیرے بندے اور تیرے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھ سے چاہا تھا۔ میں تمھاری پناہ مانگتا ہوں ہر اس شر سے، جس سے تیرے بندے اور تیرے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ چاہی تھی۔ میں تم سے سوال کرتا ہوں کہ

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ہر اس امر کو جو تو نے میرے لیے مقدر کر رکھا ہے، انجام کار ہدایت میں بدل دے'' (موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۵۱۳۷۔ مستدرک حاکم، رقم ۱۹۱۴)۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: اگر تو آخرت میں میرے ساتھ رہنا چاہتی ہے تو دنیا اتنی ہی حاصل کرنا جس قدر ایک مسافر کے پاس توشۂ راہ ہوتا ہے۔ امرا کی محافل سے دور رہنا اور کپڑا اس وقت تک نہ پھینکنا جب تک اسے پیوند نہ لگا لو (مستدرک حاکم، رقم ۷۸۶۷)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی: ''اے اللہ، مجھے ایک مسکین والی زندگی اور مسکین والی موت دینا اور روز قیامت مسکینوں کے ساتھ اٹھانا۔'' حضرت عائشہ نے سوال کیا: یارسول اللہ، ایسی دعا کیوں کر رہے ہیں؟ فرمایا: ''مساکین امرا سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ عائشہ، کسی مسکین کو ہرگز نہ دھتکارنا، چاہے کھجور کی ایک پھانک ہی دے کر رخصت کرنا۔ عائشہ، مسکینوں سے محبت کرنا اور انھیں قریب رکھنا۔ تب یقین رکھنا کہ اللہ روز حشر تمھیں اپنا قرب عطا کرے گا'' (ترمذی، رقم ۲۳۵۲)۔

حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چاند کی طرف دیکھا اور فرمایا: ''اے عائشہ، اس کے شر سے پناہ مانگو، یہی ہے اندھیرا جب چھا جاتا ہے'' (ترمذی، رقم ۳۳۶۶۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۵۸۰۲۔ مستدرک حاکم، رقم ۳۹۸۹)۔ روایت کے ظاہری الفاظ سے لگتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے براہ راست چاند کو تاریکی قرار دیا۔ اسی لیے کچھ حضرات نے اس سے چاند گرہن کا مفہوم نکال لیا۔ یہ درست نہیں، کیونکہ 'غاسق' کے صحیح معنی ہیں، اندھیری رات۔ خود قرآن مجید کے الفاظ 'اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ'، ''نماز کا اہتمام رکھو، زوال آفتاب کے اوقات سے لے کر رات کے تاریک ہونے تک'' (بنی اسرائیل ۱۷: ۷۸)، اس کی تائید کرتے ہیں۔ جملہ مفسرین نے یہ روایت نقل کرنے کے باوجود انھی معنوں کو ترجیح دی ہے۔ یہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بھی مخالف ہے: ''چاند سورج اللہ کی نشانیاں ہیں، کسی کی موت یا زندگی کی وجہ سے ان پر گرہن نہیں آتا۔ جب تم گرہن دیکھو تو اللہ سے دعا مانگو، تکبیریں کہو، نماز پڑھو اور صدقہ کرو'' (بخاری، رقم ۱۰۴۴۔ مسلم، رقم ۲۰۴۶)۔ امام رازی نے چاند کو 'غاسق' قرار دینے کی یہ توجیہ کی ہے کہ چاند اپنے اصل میں تاریک ہے۔ اس کی روشنی سورج سے مستعار ہوتی ہے (چاند پر پڑنے والی سورج کی روشنی کا محض ۳ سے ۱۲ فی صد تک زمین پر منعکس ہوتا ہے)۔ یہ روشنی بھی قمری مہینے کے آخر میں جاتی رہتی ہے۔ مولانا مودودی کہتے ہیں: چاند سے پناہ مانگنے کا مطلب ہے، چاند کے آنے کے وقت (یعنی رات) سے پناہ مانگو۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: کچھ یہودی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور 'السام علیکم' کہا جس کے معنی موت کی دعا کرنا ہے۔ مجھے ان کا مطلب سمجھ آ گیا، اس لیے جواب دیا: 'وعلیکم السام و اللعنة'، تم پر بھی موت آئے اور لعنت ہو (بندروں اور خنزیروں کے بھائیو)۔ آپ نے فرمایا: رکو عائشہ، اللہ تعالیٰ ہر کام میں نرمی پسند کرتا ہے۔ میں نے کہا: یا رسول اللہ، آپ نے ان کے کلمات نہیں سنے؟ فرمایا: تم نے میرا جواب 'وعلیکم' نہیں سنا، یعنی تم مرو (بخاری، رقم ۶۰۲۴۔ مسلم، رقم ۵۷۰۹۔ ترمذی، رقم ۲۷۰۱۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۵۰۲۹)۔ اگلی روایت میں ہے: انھیں دی گئی میری بددعا تو مقبول ہو جائے گی، البتہ میرے خلاف ان کی دعا کو قبولیت حاصل نہ ہو گی (بخاری، رقم ۶۰۳۰۔ مسلم، رقم ۵۷۱۱۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۱۵۱۰۶)۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر پر نکلے تو صدقے کے اونٹوں کے سوا کوئی اونٹ نہ تھا۔ آپ نے اپنی باقی ازواج کو جو اونٹ دیے، وہ میرے اونٹ کی طرح نہ تھے۔ مجھے ایسا اونٹ ملا جو ہٹیلا اور اڑیل تھا، کسی نے اس پر بیٹھ کر نہ دیکھا تھا۔ میں نے آپ سے شکایت کی تو فرمایا: عائشہ، اس سے نرمی برتو۔ نرمی جس شے میں شامل ہوتی ہے، اسے مزین کر دیتی ہے اور جس چیز سے جدا ہوتی ہے، اسے بدنما بنا دیتی ہے (موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۸۰۸۔ مسند اسحاق بن راہویہ، رقم ۱۵۸۶)۔

مطالعۂ مزید: السیرة النبویة (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، الجامع المسند الصحیح المختصر (بخاری، شرکة دار الارقم) المسند الصحیح المختصر من السنن (مسلم، شرکة دار الارقم)، الجمل من انساب الاشراف (بلاذری)، تاریخ الامم و الملوک (طبری)، احکام القرآن (جصاص)، الاستیعاب فی معرفة الاصحاب (ابن عبدالبر)، احکام القرآن (ابن عربی)، المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، اسد الغابة فی معرفة الصحابة (ابن اثیر)، تہذیب الکمال فی اسماء الرجال (مزی)، سیر اعلام النبلاء (ذہبی)، البدایة والنہایة (ابن کثیر)، الاصابة فی تمییز الصحابة (ابن حجر)، تہذیب التہذیب (ابن حجر)، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (مقالہ، امین اللہ وثیر)، Wikipedia, the free encyclopedia۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مقالات

رضوان اللہ

البیان

خصائص و امتیازات

(۱)

قرآن مجید کو اس وضاحت کے ساتھ اتارا گیا ہے کہ یہ سراسر ہدایت اور حق کے معاملے میں پیدا ہو جانے والے اختلافات میں خدا کی آخری حجت ہے۔ اس کی دین میں یہی حیثیت ہے کہ اسے سیکھنے اور دوسروں کو سکھانے کا کام ہر زمانے میں حقیقی مسلمانوں کا ہدف رہا ہے۔ یہ کام شروع دور میں بہت سادہ اور کسی حد تک آسان بھی تھا کہ لوگ اس کی زبان سے مکمل طور پر آشنا، اس کی آیات کے پس منظر اور جس ماحول میں یہ اُتریں، اُن سے اچھی طرح سے واقف تھے۔ لیکن یہ قدرے مشکل اور پیچیدہ ہوتا چلا گیا جب اس کتاب کے براہ راست مخاطبین اس دنیا میں نہ رہے اور بعد میں آنے والوں کی زبان میں کچھ ناگزیر تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ الفاظ میں متولد مفاہیم پیدا ہوئے تو بعض اسالیب متروک ہو کر نئی صورتوں میں ظاہر ہونے لگے۔ اس سلسلے کی ایک مشکل اُن نومسلموں کے ہاں بھی پیدا ہوئی جو عربی زبان سے قطعی نابلد ہونے کی بنا پر اپنے اور قرآن کے درمیان میں ایک قدرتی حجاب دیکھتے تھے۔ یہ حالات تھے جن میں صاحبان علم کو اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ فہم قرآن کے کام کو باقاعدہ علمی طریقے سے انجام دیا جائے۔ سو اُنھوں نے اسے متعدد زبانوں میں بیان کرنا شروع کیا جو ترجمہ کی ایک مستقل اور شان دار روایت کی صورت میں ہمارے سامنے آیا۔ اس سے پہلے کتاب کا اصل مدعا جاننے کے لیے انھوں نے بہت سی

تفسیری کاوشوں کا بھی اہتمام کیا اور اس کے لیے عام طور پر دو طریقوں کو اختیار کیا: ایک یہ کہ اپنی طرف سے کوئی بات کہنے کے بجاے صرف اگلے لوگوں کی آرا کو نقل کر دیا اور دوسرے یہ کہ اصل زبان سے استشہاد کرتے ہوئے اور تاریخ کی حتمی شہادت اور آیات کے بین السطور سے مدد لیتے ہوئے خود اس کے مطالب کو بیان کیا۔ یہ کوششیں بہت سالوں تک اسی طرح ہوتی رہیں اور مسلمانوں کے تفسیری علم میں گراں قدر اضافے کا باعث بنیں۔

تاہم، یہ سلسلہ زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا اور جلد ہی اپنی فطری صورت سے محروم، بلکہ بڑی حد تک اس سے اجنبی ہو کر رہ گیا۔ یہ اُس وقت ہوا جب مسلمانوں پر منطق ،فلسفہ اور تصوف اُن کے خارج سے اور بعض فقہی اور کلامی عصبیتیں اُن کے داخل سے اثر انداز ہونا شروع ہوئیں۔ منطق کا غلبہ ہوا تو قرآن کا ایک کلام ہونا اور اس لحاظ سے نطق ہونا، نظروں سے بالکل اوجھل ہو گیا۔ فلسفے کا رواج ہوا تو اس کی سادگی کا حسن گہنا گیا اور یہ کسی کی سمجھ میں نہ آنے والا ایک معمہ اور چیستان بن کر رہ گیا۔ تصوف کے زیر اثر اِس میں سے وہ وہ مضامین ڈھونڈ نکالنے کی سعی ہوئی کہ اس کے الفاظ اپنی حکومت بالکل کھو بیٹھے اور انجام کار ''باطن'' کے محکوم محض قرار پائے۔ اور گروہی تعصّبات نے تو اس معاملے میں قیامت ہی برپا کر دی کہ آیات کو اُن کے اصل مفہوم سے یک سر غیر متعلق کیا اور انھیں بے کار کی بحثوں میں اپنی تائید اور دوسروں کی مخالفت کا ایندھن بنا کے رکھ دیا۔

حالات کے اس تناظر میں پچھلی صدی میں بعض اہم پیش رفت ہوئیں۔ ہندوستان میں قرآن کے ایک بہت بڑے عارف، حمید الدین فراہی، خدا کی اس کتاب پر تان دیے گئے پردوں کو ہٹانے کا گویا عزم لے کر پیدا ہوئے۔ وہ اس طرح کہ زندگی بھر یہ کتاب اُن کی مساعی کا ہدف رہی۔ وہ اسی کی خاطر جیے، بلکہ صحیح لفظوں میں کہا جائے تو وہ جتنی عمر جیے، اسی کے اندر جیے۔ خدا کی طرف سے بھی یہ انعام ہوا کہ اُس نے اپنی کتاب کو سمجھنے کا فطری منہاج اُن پر بالکل کھول دیا۔ اُنھوں نے اِس کے لیے کچھ اصول مرتب کیے اور بعض سورتوں کی تفسیر بھی لکھی۔ اُن کے یہی مرتب کردہ اصول تھے جن کی روشنی میں مولانا امین احسن اصلاحی نے ''تدبر قرآن'' کے نام سے پورے قرآن پر کام کرنے کی سعادت حاصل کی۔ مولانا کے پیش نظر چونکہ ان اصولوں کی روشنی میں تفسیر کرنے کا صحیح طریق واضح کر دینا تھا، اس لیے اُن کا انہماک زیادہ تر تفسیر میں رہا اور وہ ترجمہ پر زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ محترم جاوید احمد غامدی نے ''البیان'' لکھی تو اسی کام کو آگے بڑھایا اور ترجمے میں بھی ان اصولوں کی رعایت کرنے کا پورا پورا اہتمام کیا اور مزید یہ کہ وہ خود بھی قرآن کے جید عالم ہیں، اس لیے کئی مقامات پر اپنا ایک منفرد اور مستقل موقف بھی بیان کیا۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولانا فراہی نے اس کام کی بنیادیں فراہم کیں۔ مولانا اصلاحی نے اُنھی پر ایک عمارت اُٹھائی۔

غامدی صاحب نے بھی اس کا ایک حصہ تعمیر کیا اور مزید یہ کہ اس کی تزیین و آرایش کا بھی اچھا خاصا انتظام کیا۔ اور جہاں تک راقم کی اِس تحریر کا معاملہ ہے تو اس کی حیثیت بس اتنی ہے کہ وہ ایک صدی سے زیادہ میں بننے والی اس عمارت میں اور بالخصوص اس کی آخری تعمیر میں، اتفاق سے کچھ دن گزار چکا ہے اور اس کی خوبیوں سے کچھ نہ کچھ واقفیت بھی رکھتا ہے، اس لیے اُس کے دل میں اب یہ شدید تمنا ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے اس کا خوب خوب چرچا کرے تا کہ وہ سب بھی آئیں، اِس کی سیر دیکھیں اور اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے کا سامان کریں۔

دو وجوہات ہیں کہ ہم نے غامدی صاحب کی ''البیان'' پر لکھنے کا اِرادہ کیا ہے: ایک اس وجہ سے کہ ترتیب میں مؤخر ہونے کی بنا پر یہ مولانا فراہی اور مولانا اصلاحی کے کام کی مکمل اور آخری صورت ہے اور اس لیے اس کی خصوصیات بھی بڑی حد تک اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ ہمارے پیش نظر اصل میں ترجمہ پر لکھنا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ''البیان'' ہی وہ کتاب ہے جس میں ترجمہ مکمل طور پر فراہی اصولوں کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ مزید یہ بات بھی سامنے رہے کہ اس تحریر میں ہم چاہیں بھی تو اس کے تمام خصائص و امتیازات کا جائزہ نہیں لے سکتے، اس لیے ہم صرف چند چیزوں کے بارے میں اپنی گزارشات پیش کریں گے، جیسا کہ حروف، الفاظ، اسالیب اور اس میں پائی جانے والی توضیحات کے بارے میں۔ البتہ، ہم یہ کوشش ضرور کریں گے کہ ان چیزوں کو اس طرح سے ترتیب دیں کہ قرآن کو طالب علمانہ طرز سے پڑھنے والے حضرات کے لیے یہ ایک معاون کتاب کی صورت بھی اختیار کر جائے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

باب اول

حروف

حرف آپس میں مل کر لفظ بناتے ہیں[1]۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ لفظوں کا محض ایک جز ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لفظوں کے ساتھ جڑ کر اور جملوں کے ساتھ مل کر آتے ہیں اور اُس وقت اپنا ایک مستقل مفہوم بھی رکھتے ہیں۔ کلام کی معنویت چونکہ بہت کچھ ان کے فہم پر منحصر ہوتی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ انھیں سمجھنے اور دوسری زبان میں منتقل کرنے کا کام بہت زیادہ احتیاط کے ساتھ کیا جائے۔ یہ کام ''البیان'' میں کس قدر احتیاط کے ساتھ کیا گیا ہے،

---

[1] یاد رہے کہ اس تحریر میں ہم حرف اور لفظ کا باہمی فرق اردو زبان کے لحاظ سے کر رہے ہیں، وگرنہ عربی کی نحو میں حرف کو بھی لفظ ہی کہا جاتا ہے۔

ذیل میں چند حروف کے بارے میں کیا گیا کلام اس کی کافی دلیل ہوسکتا ہے۔

''ف''

یہ حرف قرآن میں کثرت سے استعمال ہوا ہے اور اپنے اندر بہت سے معانی لیے ہوئے ہے۔ قدیم تراجم میں اسے عام طور پر ''پس'' سے بیان کیا جاتا ہے اور نسبتاً نئے ترجموں میں ''سو'' اور ''تو'' سے۔ ان میں سے ''پس'' عربی زبان کی ''ف'' ہی کی طرح معنی و مفہوم کی بہت سی جہتیں رکھتا ہے اور اپنے اندر یہ صلاحیت بھی رکھتا ہے کہ ''ف'' کو بڑی حد تک بیان کر دے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ آج کے قاری کے لیے اس کے تمام پہلوؤں کا اِدراک کرنا اور صرف اس ایک لفظ سے کلام میں موجود مختلف معانی کو اخذ کر لینا اب کسی طرح بھی ممکن نہیں رہا۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ''سو'' اور ''تو'' کا بھی ہے۔ چنانچہ اس صورت احوال میں لازم ہو جاتا ہے کہ ہم کسی آیت میں ''ف'' کا ترجمہ کرتے ہوئے اردو کے وہی الفاظ استعمال کریں جو اُس مقام میں اُس سے مراد لیے گئے ہوں۔ ہمارے خیال کے مطابق ''البیان'' میں چند دوسرے تراجم کی طرح، بلکہ اس سے کچھ مزید بڑھ کر اس ضرورت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ذیل میں ہم ''البیان'' میں کیے گئے ''ف'' کے مختلف ترجموں کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۱۔ البتہ

وَقَدۡ خَابَ مَنۡ حَمَلَ ظُلۡمًا. وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلۡمًا وَّلَا هَضۡمًا. (طٰہٰ ۲۰: ۱۱۱-۱۱۲)

''اس دن نامرادی ہے اُن کے لیے جو ظلم کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں۔ اِس کے برخلاف جو نیک عمل کرے گا اور اس کے ساتھ ایمان بھی رکھتا ہوگا، اُس کو البتہ اُس دن کسی حق تلفی اور کسی زیادتی کا اندیشہ نہ ہوگا۔''

مذکورہ آیت میں 'فَلَا يَخٰفُ ظُلۡمًا' کی ''ف'' کا ترجمہ عام طور پر ''تو'' اور ''سو'' سے کیا گیا ہے۔ اس سے عام قارئین پر یہ بالکل بھی واضح نہیں ہو پاتا کہ یہ جملہ 'قَدۡ خَابَ' کے تقابل میں آنے کی وجہ سے اپنے اندر مقابلے کا مفہوم اور ایک طرح کی تاکید بھی رکھتا ہے۔

ان کے بجائے ''البتہ'' کا لفظ، ہم دیکھ سکتے ہیں کہ بڑی آسانی سے ان دونوں پہلوؤں کو بیان کر رہا ہے۔

۲۔ لیکن

حٰفِظُوۡا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الۡوُسۡطٰى وَقُوۡمُوۡا لِلّٰهِ قٰنِتِيۡنَ. فَاِنۡ خِفۡتُمۡ فَرِجَالًا اَوۡ

رُكۡبَانًا فَاِذَآ اَمِنۡتُمۡ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمۡ مَّالَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ.

(البقرہ۲: ۲۳۸-۲۳۹)

''اپنی نمازوں کی حفاظت کرو، بالخصوص اُس نماز کی جو درمیان میں آتی ہے، اور اللہ کے حضور میں نہایت ادب کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ پھر اگر خطرے کا موقع ہو تو پیدل یا سواری پر، جس طرح چاہے پڑھ لو۔ لیکن جب امن ہو جائے تو اللہ کو اُسی طریقے سے یاد کرو جو اُس نے تمھیں سکھایا ہے، جسے تم نہیں جانتے تھے۔''

ان آیات کا اصل مدعا یہ ہے کہ نمازوں کی حفاظت کی جائے اور انھیں خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کیا جائے۔ پھر خوف کی حالت میں ایک رخصت کا بیان کر کے 'فَاِذَآ اَمِنۡتُمۡ' کے الفاظ میں اصل مدعا کی پھر سے تاکید کر دی گئی ہے۔ اس ''ف'' کے لیے زیادہ تر مترجمین نے ''پھر'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کے مقابلے میں ''البیان'' میں ''لیکن'' کا لفظ آیا ہے جو بخوبی بتا رہا ہے کہ یہ رخصت اصل حکم میں محض استثنا کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوا ہے کہ یہ اصل حکم کی اہمیت کو نظروں سے اوجھل بھی نہیں ہونے دے رہا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۳۔ تاہم

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوۡلٍ حَسَنٍ وَّ اَنۡۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا. (آل عمران۳: ۳۷)

''تاہم اُس کے پروردگار نے اُس لڑکی کو بڑی خوشی کے ساتھ قبول فرمایا اور نہایت عمدہ طریقے سے پروان چڑھایا۔''

حضرت مریم کی والدہ نے اپنا بچہ خدا کے لیے وقف کرنے کی نذر مانی۔ توقع کے برعکس، ان کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی تو انھیں اس بات کا کچھ ملال ہوا کہ وہ بیٹے کے بجاے اُسے وقف کر رہی ہیں۔ مگر خدا نے اسی بیٹی کو قبول فرمایا اور بڑی اچھی طرح سے قبول فرمایا۔ اسی بات کو 'فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوۡلٍ حَسَنٍ' کے جملے میں بیان کیا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہاں ''ف'' کا ترجمہ ''تاہم'' کے لفظ سے کرنا بڑا معنی خیز ہے اور والدۂ مریم کے اِس تردد، اور اس کے باوجود خدا کی طرف سے ہونے والی قبولیت کو خوب خوب بیان کر رہا ہے۔

۴۔ اچھا تو

فَخُذۡ اَرۡبَعَةً مِّنَ الطَّيۡرِ فَصُرۡهُنَّ اِلَيۡكَ. (البقرہ۲: ۲۶۰)

''اچھا، تو چار پرندے لے لو، پھر اُن کو اپنے ساتھ ہلا لو۔''

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے خدا سے درخواست کی کہ مجھے دکھائیں کہ آپ مردوں کو کس طرح سے زندہ کریں گے؟ فرمایا: کیا تم ایمان نہیں رکھتے؟ عرض کیا: ایمان تو رکھتا ہوں، لیکن خواہش ہے کہ میرا دل پوری طرح سے مطمئن

ہو جائے۔اس پر فرمایا ہے کہ اگر تم ایمان رکھتے ہو اور محض شرح صدر کے لیے یہ دیکھنا چاہتے ہو تو یوں کرو کہ.....اور اس ساری بات کے لیے یہاں صرف ''ف'' کو استعمال کیا ہے۔اب دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ ''پس'' اور ''پھر'' کے مقابلے میں ''البیان'' میں لائے گئے ''اچھا، تو'' کے الفاظ اس بات کو کس خوب صورتی سے ادا کر رہے ہیں۔

ایک مقام پر ''ف'' کا ترجمہ انھی ''اچھا تو'' کے الفاظ میں کیا ہے، مگر اس سے کلام کے ایک اور پہلو کو کھولا ہے:

وَاَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا اَفَلَمۡ تَکُنۡ اٰیٰتِیۡ تُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ فَاسۡتَکۡبَرۡتُمۡ وَکُنۡتُمۡ قَوۡمًا مُّجۡرِمِیۡنَ. (الجاثیہ ۴۵:۳۱)

''رہے وہ جنھوں نے ماننے سے انکار کر دیا تھا، اُن سے کہا جائے گا: اچھا تو میری آیتیں کیا تمھیں پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں؟ مگر تم نے تکبر کیا اور تم مجرم لوگ تھے۔''

یہ آخرت کے دن کا بیان ہے۔یہاں ''اچھا تو'' کے الفاظ ایک تو منکروں کی طرف خدا کے اُس التفات کو بیان کر رہے ہیں جس کے بعد اُن سے شدید باز پرس ہوا چاہتی ہے، اور دوسرے اُس تردید کو بھی بیان کر رہے ہیں جو خدا کی طرف سے اُن کی متوقع معذرتوں پر کی گئی ہے۔

۵۔اچھا

فَانۡتَظِرُوۡۤا اِنِّیۡ مَعَکُمۡ مِّنَ الۡمُنۡتَظِرِیۡنَ. (الاعراف ۷:۷۱)

''اچھا، انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔''

حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے دعوت توحید کو اس طرح سے پیش کیا کہ ان سے خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔قوم نے پھر بھی ماننے سے انکار کیا تو اُن کے ایمان سے قطعی مایوس ہو کر اور کچھ دھمکی آمیز اسلوب میں فرمایا ہے: 'فَانۡتَظِرُوۡۤا اِنِّیۡ مَعَکُمۡ مِّنَ الۡمُنۡتَظِرِیۡنَ'۔''البیان'' میں یہاں ''ف'' کا ترجمہ ''اچھا'' کے لفظ سے کیا گیا ہے اور ہمارے خیال میں مایوسی اور دھمکی کے ان دو پہلوؤں کو بہت واضح طور پر بیان کر رہا ہے۔

۶۔آخر کار

فَاَنۡجَیۡنٰہُ وَالَّذِیۡنَ مَعَہٗ بِرَحۡمَۃٍ مِّنَّا. (الاعراف ۷:۷۲)

''آخر کار ہم نے اُس کو اور اُنھیں جو اُس کے ساتھ تھے، اپنی رحمت سے بچا لیا۔''

یہ سیدنا ہود علیہ السلام کی سرگذشت کا آخری جملہ ہے۔کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد اُن کی دھمکی کے واقع ہو جانے اور جس مقصد سے یہ سرگذشت سنائی گئی ہے، اُسے بیان کرنے کے لیے یہاں ''ف'' لائی گئی ہے۔''آخر کار''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کا لفظ اصل میں انھی دونکتوں کا نہایت بلیغ بیان ہے۔

۷۔اب

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَذَّبَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَصَدَفَ عَنْھَا. (الانعام۶:۱۵۷)

''اب اُن سے بڑھ کر کون ظالم ہو گا جو اللہ کی آیتوں کو جھٹلا دیں اور اُن سے منہ موڑیں۔''

قریش سے فرمایا ہے کہ ہم نے یہ کتاب اس لیے اُتاری ہے کہ مبادا تم کہو کہ کتاب تو ہم سے پہلے کے دو گروہوں پر اتاری گئی تھی اور ہم اُن کے پڑھنے پڑھانے سے بالکل بے خبر تھے۔ یا کہو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم اُن سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے۔ سو تمھارے پروردگار کی طرف سے ایک واضح حجت اور ہدایت و رحمت تمھارے پاس آ گئی ہے۔ اس کے بعد فرمایا ہے: 'فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَذَّبَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ'۔ یہاں ''ف'' کا مطلب یہی ہے کہ اس کتاب کے آ جانے کے بعد تمھارے سب عذر ختم ہو گئے ہیں، چنانچہ جو اب بھی اسے جھٹلا دے گا، آخر اُس سے بڑا ظالم کون ہو گا۔ ''اب'' کا لفظ اسی مطلب کو ادا کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔

بعض مقامات پر موقع کلام اور فعل کے تکمیلی پہلو کی رعایت کرتے ہوئے اسی ''اب'' کے ساتھ کچھ اور لفظوں کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ جیسا کہ مثال کے طور پر ''اب ذرا'' اور ''اب جاؤ'' وغیرہ:

فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِکَ وَشَرَابِکَ لَمْ یَتَسَنَّهْ. (البقرہ۲:۲۵۹) ''اب ذرا اپنے کھانے اور پینے کی چیزوں کو دیکھو، اِن میں سے کوئی چیز سڑی نہیں۔''

فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ. (البقرہ۲:۶۸) ''اب جاؤ اور وہ کرو جس کا تمھیں حکم دیا جا رہا ہے۔''

۸۔اُس وقت

ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمْ مَّرْجِعُکُمْ فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ. (الانعام۶:۱۶۴)

''پھر تمھارے پروردگار ہی کی طرف تم سب کو پلٹنا ہے۔ اُس وقت وہ تمھیں بتا دے گا جس چیز میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔''

یہاں ''ف'' کا ترجمہ عام طور پر ''پھر'' سے کیا گیا ہے۔ اس کے بجائے ''اُس وقت'' کے الفاظ اس اعتبار سے بہت بہتر ہیں کہ یہ اُس کے ظرف ہونے کو بھی بیان کر رہے ہیں اور معنی میں اس سے پچھلے جملہ کے ''ثم''، یعنی ''پھر'' سے اس کے مختلف ہونے کو بھی نمایاں کر رہے ہیں۔ ''ف'' کے اس ظرفیہ استعمال کی اور بھی کئی مثالیں قرآن میں

موجود ہیں، جیسا کہ مثال کے طور پر:

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِھِمْ فَاَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ عَلَیْھِمْ. (الفتح ۴۸: ۱۸)

’’اللہ ایمان والوں سے راضی ہو گیا، جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے، اُس وقت اللہ نے جان لیا جو کچھ اُن کے دلوں میں تھا تو اُس نے اُن پر طمانیت اتار دی۔‘‘

۹۔ پھر یہی نہیں

فَاَمَّا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَاُعَذِّبُھُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَمَالَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ.

(آل عمران ۳: ۵۶)

’’پھر یہی نہیں، اِن منکروں کو میں دنیا اور آخرت، دونوں میں سخت سزا دوں گا، اور وہ کوئی مددگار نہ پائیں گے۔‘‘

یہاں بنی اسرائیل کے انکار کے نتیجے میں خدائی دینونت کے ظہور کا اعلان ہوا ہے۔ یعنی، اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان لوگوں سے الگ کر کے اپنے پاس لے جائے گا اور ماننے والوں کو اُن کے منکروں پر غلبہ عطا کرے گا اور آخرت میں ان سب کے اختلافات کی حقیقت بھی کھول دے گا۔ اور صرف یہی نہیں ہو گا، بلکہ منکروں کو دنیا اور آخرت، دونوں میں عذاب اور ماننے والوں کو اُن کی محنت کا صلہ بھی عطا کرے گا۔ ’فَاَمَّا الَّذِیْنَ‘ کے ’’ف‘‘ کا ترجمہ ’’پھر یہی نہیں‘‘ کے الفاظ میں کریں تو یہ ساری بات ادا ہو جاتی ہے۔ اس کے بجاے ’’سو‘‘ لایا جائے تو اصل بات کسی طرح بھی واضح نہیں ہو پاتی اور اگر ’’پھر‘‘ لایا جائے تو سرے سے اصل مدعا ہی خراب ہو جاتا ہے۔

۱۰۔ مگر

وَاَمَّا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَفَلَمْ تَکُنْ اٰیٰتِیْ تُتْلٰی عَلَیْکُمْ فَاسْتَکْبَرْتُمْ وَکُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ.

(الجاثیہ ۴۵: ۳۱)

’’رہے وہ جنھوں نے ماننے سے انکار کر دیا تھا، اُن سے کہا جائے گا: اچھا تو میری آیتیں کیا تمھیں پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں؟ مگر تم نے تکبر کیا اور تم مجرم لوگ تھے۔‘‘

اللہ تعالیٰ کا منکرین سے یہ پوچھنا کہ تمھیں میری آیتیں کیا پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں؟ استفسار کے لیے نہیں، بلکہ اقرار کے لیے ہو گا۔ مطلب یہ ہو گا کہ تمھیں میری آیتیں واقعتاً پڑھ کر سنائی جاتی تھیں۔ چنانچہ اس کے بعد ’فَاسْتَکْبَرْتُمْ‘ کی ’’ف‘‘ کا ترجمہ ’’مگر‘‘ سے کرنا ہی زیادہ موزوں ہو سکتا ہے جو اس بات کو بھی بیان کر رہا ہے کہ اُن

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پر یہ آیتیں یقیناً پڑھ کر سنائی جاتی تھیں اور اُس ملامت کو بھی بیان کر رہا ہے جو ان آیتوں کے مقابلے میں استکبار کرنے پر اُنھیں کی جا رہی ہے۔

۱۱۔اس لیے

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ. (البقرہ۲: ۸۸)

''اور انھوں نے کہا: ہمارے دلوں پر غلاف ہیں۔ نہیں، بلکہ اِن کے اس کفر کی وجہ سے اللہ نے اِن پر لعنت کر دی ہے، اس لیے اب یہ کم ہی مانیں گے۔''

یہود نے مسلسل انکار کی روش اختیار کی تو اس کی پاداش میں خدا کی طرف سے اُن پر لعنت کر دی گئی۔ ہم جانتے ہیں کہ اس لعنت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ملعونین ایمان لانے سے یک سر محروم ہو جاتے ہیں، چنانچہ فرمایا ہے: 'فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ'۔ اس لیے اب یہ کم ہی مانیں گے۔ یہاں ''ف'' کو ''اس لیے'' کے الفاظ میں بیان کرنا، اس اعتبار سے زیادہ صحیح ہے کہ لعنت اور ایمان سے مستقل محرومی[۲] کے درمیان میں جو سبب اور مسبب کا تعلق پایا جاتا ہے، یہ اُسے بہت اچھی طرح سے واضح کر دیتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۱۲۔اس کے باوجود

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ. (البقرہ۲: ۷۵)

''اس کے باوجود، (مسلمانو)، کیا تم ان سے یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ تمھاری بات مان لیں گے۔''

اس مقام پر یہود کے ہاں دینی امور میں پائے جانے والے گریز اور اُن کی سرکشی کا بیان ہوا ہے۔ اس دوران میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے: 'اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ'۔ دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ یہاں ''ف'' کا ترجمہ ''اس کے باوجود'' کے الفاظ میں ادا کرنا بہت زیادہ مناسب ہے اور مسلمانوں کو اُن کی سادہ لوحی پر بہت اچھے طریقے سے متنبہ کر رہا ہے جو یہود کے اِس منفی رویے کے باوجود اُن سے بعض مثبت امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔

۱۳۔اس پر بھی

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ. (البقرہ۲: ۱۸۴)

۲۔ یاد رہے، یہاں ''کم ہی مانیں گے'' سے مراد یہ نہیں ہے کہ ان کے ایمان کی کچھ نہ کچھ توقع بہر حال ابھی پائی جاتی ہے۔ بلکہ یہ کسی چیز کی مطلق نفی کرنے کا ویسا ہی اسلوب ہے، جیسا کہ ہم کسی کی بے جا حرکتوں کو دیکھ کر اس سے بالکل مایوس ہو جائیں اور کہیں کہ اس کے سدھرنے کا اب کم ہی اِمکان ہے۔

''اس پر بھی جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کر لے۔''

ایمان والوں پر روزے فرض کیے گئے ہیں تا کہ اُن میں اللہ کا ڈر پیدا ہو۔ روزہ اپنی ذات میں ایک پابندی کا نام ہے جو بالعموم نفس پر شاق گزرتی ہے، چنانچہ فرمایا ہے کہ یہ بہت زیادہ نہیں، بلکہ گنتی کے چند روز ہیں۔ مزید یہ کہ کسی معقول عذر کی وجہ سے اگر یہ مقررہ دنوں میں نہ رکھے جا سکیں تو دوسرے دنوں میں رکھ لیے جائیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہاں ''ف'' کا ترجمہ ''اس پر بھی'' کے الفاظ میں کرنا، جس طرح روزوں کے متعلق رعایت کے پہلو کو بیان کر رہا ہے، اسی طرح روزوں میں پائی جانے والی مشقت کے ہلکے پن کی طرف اشارہ کر کے ہمیں اُن کی ترغیب بھی دے رہا ہے۔

یہ اسلوب اُن مقامات پر بھی آیا ہے جہاں کچھ حرمتوں سے باز رہنے کا حکم دیا ہے اور مقصد یہی ہے کہ ان احکام میں پائی جانے والی نرمی کو نمایاں کیا جائے۔ جیسا کہ مثال کے طور پر جب مردار، خون، سؤر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ حرام قرار دیا تو اسی ''ف'' کو استعمال کیا ہے اور ''البیان'' میں وہاں بھی اس کا ترجمہ ''اس پر بھی'' کے الفاظ ہی سے کیا گیا ہے:

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ. (البقرہ ۲: ۱۷۳)

''اس پر بھی جو مجبور ہو جائے، اس طرح کہ نہ چاہنے والا ہو، نہ حد سے بڑھنے والا تو اُس پر کوئی گناہ نہیں۔''

۱۴۔ اِس طرح

فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ. (طٰهٰ ۲۰: ۴۰)

''اِس طرح ہم نے تم کو تمھاری ماں کی طرف لوٹا دیا کہ اُس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور اُس کو غم نہ رہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے خدا سے الہام پا کر اُنھیں دریا کے حوالے تو کر دیا، مگر اپنے بچے سے یہ دوری برداشت کرنا اُن کے لیے کوئی آسان ہدف نہ تھا۔ سو خدا نے اپنی تدبیر سے کچھ ایسے انتظامات کیے کہ یہ سب دوریاں ختم ہو گئیں۔ ان انتظامات کی تفصیل ذکر کرنے کے بعد ان کا نتیجہ یوں بیان فرمایا ہے: 'فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ'۔ ''اس طرح'' کے الفاظ اصل میں اسی نتیجے کو بیان کر رہے ہیں۔

قرآن میں اس ''ف'' کو اور بھی کئی مقامات پر لایا گیا ہے، جیسا کہ مثال کے طور پر یہ آیت:

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ. (البقرہ ۲: ۵۰)

''اور یاد کرو، جب ہم نے تمھیں ساتھ لے کر دریا چیر دیا اور اِس طرح تمھیں بچا لیا۔''

۱۵۔ ورنہ

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ. (الاعراف ۷: ۱۹)

''ہاں، البتہ تم دونوں اِس درخت کے پاس نہ جانا، ورنہ ظالم ٹھیرو گے۔''

حضرت آدم سے کہا گیا ہے کہ وہ اور ان کی بیوی اس باغ میں رہیں اور اس میں سے جہاں سے چاہیں، کھائیں۔ ہاں، ان پر ایک پابندی ضرور ہے کہ وہ اس درخت کے پاس نہ جائیں۔ 'فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ' کہ اس کی خلاف ورزی پر وہ خدا کے ہاں ظالم قرار پائیں گے۔ اس پابندی اور خلاف ورزی کی صورت میں نکلنے والے اس کے نتیجے کو ''ورنہ'' کا یہ لفظ ''پس'' یا ''پھر'' کے مقابلے میں زیادہ اچھی طرح سے ادا کر رہا ہے۔

ذیل کی اس آیت میں بھی ''ف'' اسی مفہوم کے لیے آیا ہے:

وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ. (الاعراف ۷: ۷۳)	''اور کسی برے ارادے سے اِس کو ہاتھ نہ لگانا، ورنہ ایک دردناک عذاب تمھیں آ پکڑے گا۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۶۔ ''ف'' کے دیگر ترجمے

۱۔ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ. (البقرہ ۲: ۲۴۹)

''اس کی صورت یہ ہوگی کہ جو اِس کا پانی پیے گا، وہ میرا ساتھی نہیں ہے۔''

طالوت جب اپنی افواج کو لے کر نکلے تو اُنھوں نے لوگوں کو بتایا کہ اللہ نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ایک ندی کے ذریعے سے تمھارا امتحان کرے گا۔ اس امتحان کی صورت کیا ہوگی؟ کہا: 'فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ'۔ یہ ''ف'' تفصیل کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ''البیان'' میں اس کا ترجمہ ''اس کی صورت یہ ہوگی'' کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔

۲۔ وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا. (البقرہ ۲: ۶۰)	''اور یاد کرو، جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دعا کی تو ہم نے کہا: اپنی لٹھیا اِس پتھر پر مارو۔ (اُس نے ماری) تو اُس سے بارہ چشمے بہ نکلے۔''

'فَانْفَجَرَتْ' کی اس ''ف'' سے پہلے جو نحویوں کے ہاں فاے فصیحہ کہلاتی ہے، کوئی بات محذوف مانی جاتی ہے۔ ''البیان'' میں پہلے اُس بات یعنی ''اُس نے ماری'' کو ظاہر کیا گیا ہے اور پھر ''تو'' کے ساتھ اُس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

۳۔ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ. فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً. (الذاریات ۵۱: ۲۷-۲۸)	''اُس نے کہا: کیوں آپ کھاتے نہیں؟ پھر (اُن کے تردد کو دیکھ کر) اُس نے اپنے دل میں اُن سے کچھ

اندیشہ محسوس کیا۔''

'فَاَوۡجَسَ' کی یہ ''ف'' اپنے ماقبل سے سبب کا تعلق رکھتی ہے، مگر اسے سادہ انداز میں بیان کیا جائے تو کچھ مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر، ''سو'' یا ''پھر'' وغیرہ سے ترجمہ کریں تو اس میں ترتیب یا تعقیب کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے جو یہاں بالکل بھی مقصود نہیں۔ اور اگر ''اس پر'' وغیرہ کے الفاظ لائیں تو ان سے سبب تو واضح ہو جاتا ہے، مگر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے اس سوال کہ ''آپ کھاتے کیوں نہیں؟'' اور اس بات کے درمیان میں کہ ''اس نے اپنے دل میں اُن سے کچھ اندیشہ محسوس کیا''، کوئی سبب واضح نہیں ہو پاتا۔ ''البیان'' میں اس کا حل یہ نکالا گیا ہے کہ ''پھر'' کا لفظ لا کر ''اُن کے تردد کو دیکھ کر'' کا وہ فقرہ بھی لکھ دیا گیا ہے جو پچھلے جملوں سے خود بخود مفہوم ہو رہا ہے۔

اس سے کچھ ملتی جلتی مثال یہ آیت بھی ہے:

فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهٖ مِنۡهُنَّ فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ فَرِيۡضَةً. (النساء ۴:۲۴)	''پھر (اِس سے پہلے اگر مہر ادا نہیں کیا ہے تو) جو فائدہ اُن سے اٹھایا ہے، اُس کے صلے میں اُن کا مہر اُنھیں ادا کرو، ایک فرض کے طور پر۔''

'فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ' کے اس ''ف'' میں بھی سابقہ جملوں سے مترشح ہونے والا ایک مفہوم مضمر ہے۔ دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ جب اسے کھول دیا گیا تو اس کے نتیجے میں وہ ساری بحث سرے سے ختم ہو گئی جو آیت کے الفاظ اور سیاق و سباق سے صرف نظر کرتے ہوئے بعض حضرات نے یہاں پیدا کر لی ہے۔

۴۔ فَاِنَّمَا يَسَّرۡنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ. (الدخان ۴۴:۵۸)	''سو (اُنھیں اِسی قرآن سے یاددہانی کرتے رہو، اے پیغمبر، اس لیے کہ) ہم نے تو اِس کو تمھاری زبان میں نہایت موزوں بنایا ہے، اِسی لیے کہ یہ یاددہانی حاصل کریں۔''

یہ ''ف'' پچھلی کسی ایک بات پر نہیں، بلکہ پورے سلسلۂ کلام پر آ گئی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ''ف'' کا ترجمہ کرتے ہوئے کچھ ایسی وضاحت بھی کر دی جائے جو پچھلے سارے مضمون کے ساتھ اس کے اتصال کو بیان کر دے۔

۵۔ فَاَقۡبَلَتِ امۡرَاَتُهٗ فِيۡ صَرَّةٍ فَصَكَّتۡ وَجۡهَهَا وَقَالَتۡ عَجُوۡزٌ عَقِيۡمٌ. (الذاریات ۵۱:۲۹)	''اُس کی بیوی یہ سن کر حیرانی کے عالم میں آگے بڑھی، اپنا ماتھا پیٹا اور بولی: بڑھیا بانجھ، (اب جنے گی)؟''

یہاں یہ بات بھی یاد رہنی چاہیے کہ ''ف'' کا ترجمہ ضرور ہی کیا جائے، یہ ہر صورت میں لازم نہیں ہوتا۔ بعض

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اوقات اردو کے جملوں کی ترکیب خود ہی اسے بیان کر رہی ہوتی ہے۔ ایسے میں لفظی ترجمہ پر اصرار کیا جائے تو کلام کی روانی میں خلل واقع ہوتا اور اس کی خوب صورتی بھی بڑی حد تک متاثر ہوتی ہے۔ چنانچہ ''البیان'' میں اسی لیے 'فَصَكَّتْ وَجْهَهَا' کے ''ف'' کا لفظی ترجمہ چھوڑ دیا گیا ہے۔

''واو''

''واو'' کا حرف بھی قرآن میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ اسے مترجمین بالعموم ''اور'' کے لفظ سے ادا کرتے ہیں۔ یہ اس لحاظ سے درست ہے کہ عربی کے ''واو'' کی طرح یہ بھی اپنے اندر معنی و مفہوم کی بہت سی وسعتیں رکھتا ہے، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں کو اپنی گرفت میں لے لینا، ایک عام قاری کے بس کی بات نہیں۔ چنانچہ قرآن کے اصل فہم کو ترجمے میں منتقل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ ''واو'' جس مقام پر جس معنی میں استعمال ہوا ہو، وہاں اُسی معنی کو ادا کرنے والے اردو کے الفاظ لائے جائیں۔ ''البیان'' میں یہ اہتمام کس قدر کیا گیا ہے، ذیل کی چند مثالیں بڑی حد تک اسے بیان کر دیتی ہیں:

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ا۔ ہاں

وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا. (النساء ۴: ۵)

''ہاں، اِس سے فراغت کے ساتھ اُن کو کھلاؤ، پہناؤ اور اُن سے بھلائی کی بات کرو۔''

یتیموں کے بارے میں فرمایا ہے کہ اگر وہ نادان اور بے سمجھ ہوں تو اُن کا مال اُن کے حوالے نہ کرو۔ اس ہدایت کا منشا یہ بالکل نہیں تھا کہ اُن کی واجبی ضروریات کو بھی پورا نہ کیا جائے، چنانچہ اصل حکم پر استدراک کرتے ہوئے فرمایا ہے: 'وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ'۔ یعنی، جہاں تک اُن کی ضروریات کا تعلق ہے تو انھیں فراغت کے ساتھ پورا کرو۔ یہاں ''واو'' کا ترجمہ ''اور'' کے لفظ سے کریں تو یہ مدعا کسی طرح بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کے مقابلے میں ''ہاں'' کا لفظ آسانی سے اس مشکل کو حل کر دیتا ہے۔

''البیان'' میں بعض مقامات پر کلام کی مناسبت سے اس ''ہاں'' میں مزید لفظوں کا اضافہ بھی کیا گیا ہے، جیسا کہ ''ہاں، البتہ'' یا ''اور ہاں'' وغیرہ:

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ ''ہاں، البتہ تم دونوں اِس درخت کے پاس نہ جانا،

الظّٰلِمِیۡنَ. (الاعراف ۷:۱۹) ورنہ ظالم ٹھیرو گے۔‘‘

یہاں ’’ہاں‘‘ کے ساتھ ’’البتہ‘‘ کا استعمال درخت کے پاس نہ جانے کے حکم میں پائی جانے والی ایک طرح کی تاکید کو بیان کر رہا ہے۔

وَلَا تُبَاشِرُوۡھُنَّ وَاَنۡتُمۡ عٰکِفُوۡنَ فِی الۡمَسٰجِدِ. (البقرہ ۲:۱۸۷) ’’اور ہاں، تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو تو (رات کو بھی) بیویوں کے پاس نہ جانا۔‘‘

’وَلَا تُبَاشِرُوۡھُنَّ‘ کا ’’واو‘‘ اُس بات میں استثنا کو بیان کر رہا ہے جو کئی جملے پیچھے مذکور ہوئی ہے اور اس کے بعد اس کی بعض ضمنی تفصیلات آ گئی ہیں۔ چنانچہ بہتر یہی تھا کہ ’’ہاں‘‘ لا کر جس طرح استثنا کو بیان کیا جائے، اسی طرح ’’اور‘‘ لا کر اُس دور پڑی ہوئی بات کو ذرا قریب بھی کر دیا جائے۔

۲۔ بلکہ

اُولٰٓئِکَ لَا خَلَاقَ لَھُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ وَلَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ وَلَا یَنۡظُرُ اِلَیۡھِمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیۡھِمۡ وَلَھُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ. (آل عمران ۳:۷۷)

’’اُن کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے، اور اللہ قیامت کے دن نہ اُن سے بات کرے گا، نہ اُن کی طرف نگاہ التفات سے دیکھے گا اور نہ اُنھیں (گناہوں سے) پاک کرے گا، بلکہ وہاں اُن کے لیے ایک دردناک سزا ہے۔‘‘

جنھوں نے اللہ کے ساتھ کیے ہوئے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے میں دنیا کے مفادات کو ترجیح دی ہے، ان کے بارے میں فرمایا ہے کہ اُنھیں آخرت میں کوئی فائدہ نہ ملے گا، بلکہ یہ سب ملنا تو بہت دور کی بات: ’وَلَھُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ‘، اُنھیں تو وہاں دردناک عذاب بھگتنا ہوگا۔ دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ ’’اور‘‘ کے بجائے ’’بلکہ‘‘ کا استعمال اس ساری بات کو کس خوبی سے ادا کر رہا ہے۔

بعض مقامات پر ’’بلکہ‘‘ کے ساتھ اِس ’’واو‘‘ سے پہلے کی بات کو بھی دہرا دیا گیا ہے اور اس سے کلام کی معنویت اور زیادہ کھل گئی ہیں اور وہ قریب الفہم بھی ہو گیا ہے:

وَلَوۡلَاۤ اَنۡ یَّکُوۡنَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً لَّجَعَلۡنَا لِمَنۡ یَّکۡفُرُ بِالرَّحۡمٰنِ لِبُیُوۡتِھِمۡ سُقُفًا مِّنۡ فِضَّۃٍ وَّمَعَارِجَ عَلَیۡھَا یَظۡھَرُوۡنَ. وَلِبُیُوۡتِھِمۡ اَبۡوَابًا وَّسُرُرًا عَلَیۡھَا یَتَّکِـُٔوۡنَ.

’’اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے (اور کوئی ایمان پر نہیں رہے گا) تو جو لوگ خداے رحمٰن کے منکر ہو رہے ہیں، اُن کے گھروں کی چھتیں ہم چاندی کی کر دیتے اور زینے بھی جن پر

وَ زُخرُفًا. (الزخرف۴۳: ۳۳-۳۵)

وہ چڑھتے اور اُن کے گھروں کے دروازے اور اُن کے تخت جن پر وہ تکیے لگا کر بیٹھتے، بلکہ (چاندی ہی نہیں)، سونے کے بھی۔''

۳۔اب

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمنَآ اَنفُسَنَا وَاِن لَّم تَغفِرلَنَا وَ تَرحَمنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الخٰسِرِينَ. (الاعراف۷: ۲۳)

''دونوں بول اٹھے: پروردگار، ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، اب اگر تو ہماری مغفرت نہ فرمائے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو ہم ضرور نامراد ہو جائیں گے۔''

یہ آدم وحوا کی توبہ کے الفاظ ہیں۔ اُنھوں نے پہلے اعتراف کیا ہے کہ ہم نے غلطی کا ارتکاب کیا اور اس طرح اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ پھر عرض کیا ہے: 'وَاِن لَّم تَغفِرلَنَا وَ تَرحَمنَا'۔ اِس ''واو'' کا ترجمہ ''اور'' کے بجائے ''اب'' کے لفظ سے کریں تو غلطی کے بعد اُن کی پشیمانی اور اس کے بعد اپنے آپ کو خدا کے آگے ڈال دینا، یہ دونوں ہی جہتیں بڑی خوب صورتی کے ساتھ ادا ہو جاتی ہیں۔

۴۔اس کے برخلاف

وَلَقَد اٰتَينَا دَاوٗدَ وَ سُلَيمٰنَ عِلمًا وَ قَالَا الحَمدُ لِلّٰهِ الَّذِي فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيرٍ مِّن عِبَادِهِ المُؤمِنِينَ. (النمل۲۷: ۱۵)

''اس کے برخلاف ہم نے داوٗد اور سلیمان کو بڑا علم عطا فرمایا تھا، (مگر وہ ہمارے حضور جھکتے ہی چلے گئے) اور اُنھوں نے کہا: شکر ہے اللہ کے لیے جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔''

پہلے فرعون اور اُس کی قوم کا ذکر کیا ہے جن کے ظلم اور گھمنڈ کی وجہ سے اُن پر خدا کا عذاب نازل ہوا۔ اس کے بعد حضرت داوٗد اور سلیمان کا ذکر کیا جو خدا کی نعمتوں کو پا کر کسی تکبر میں مبتلا نہیں ہوئے، بلکہ اُس کا حد درجہ شکر ادا کرنے والے ہوئے۔ ان دو رویوں کے باہم مختلف ہونے کو واضح کرنے کے لیے ''البیان'' میں 'وَلَقَد' کے واو کا ترجمہ ''اس کے برخلاف'' کے الفاظ میں کیا گیا ہے اور ہمارے خیال میں یہی زیادہ صحیح ہے۔

''البیان'' میں ''واو'' کے اس ترجمہ کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، اس لیے کہ قرآن میں اِنذار اور بشارت کے نقطۂ نظر سے اکثر دو باہم متضاد معاملات زیر بحث آتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۵۔لیکن

قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ. (البقرہ۲: ۲۱۷)

''کہہ دو کہ اِس میں قتال بڑی ہی سنگین بات ہے، لیکن اللہ کی راہ سے روکنا اور اُس کو نہ ماننا اور بیت الحرام کا راستہ لوگوں پر بند کرنا اور اُس کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اِس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔''

حرام مہینوں میں قتال کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا ہے کہ ان میں قتال کرنا واقعتاً سنگین بات ہے۔اس کے بعد استدراک کرتے ہوئے فرمایا ہے: 'وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ...' یعنی، جو رویہ مشرکین نے اختیار کر رکھا ہے، وہ تو اس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ یہاں ''واو'' کا ترجمہ ''اور'' سے کریں تو یہ مضمون کچھ ہلکا سا ہو جاتا ہے، مگر اس کے مقابلے میں ''لیکن'' کا لفظ اسے پوری شدت کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔

اگر استدراک کی اس ''واو'' کو نہ سمجھا جائے اور اسے ادا کرنے کے لیے لفظ بھی ''اور'' ہی کا استعمال میں لایا جائے تو بعض اوقات اصل مدعا نظروں سے اوجھل ہو جاتا، حتیٰ کہ بعض صورتوں میں بالکل خلط ملط ہو کر رہ جاتا ہے، جیسا کہ اس آیت میں:

وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ. (النساء۴: ۱۱)

''لیکن ترکے کا چھٹا حصہ، (اس سے پہلے) میت کے والدین میں سے ہر ایک کو ملنا چاہیے، اگر اُس کی اولاد ہو۔''

مترجمین نے عام طور پر اس ''واو'' کو عطفِ جمع کی واو سمجھا اور اس کا ترجمہ بھی اس لحاظ سے ''اور'' کے لفظ کے ساتھ کیا ہے۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وراثت کی بعض صورتوں میں وہ الجھنیں پیدا ہوئیں جو خدا کے مقرر کردہ حصوں میں کمی بیشی کیے بغیر کسی طرح سلجھ نہیں سکیں۔ ''البیان'' میں کیے گئے ''لیکن'' کے ترجمہ سے کوئی الجھن سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتی کہ اِس ''لیکن'' کا یہ ناگزیر تقاضا ہے کہ ترکے میں سے والدین کے حصے بچوں کو مال دینے سے پہلے ہی نکال لیے جائیں۔

بعض مقامات پر یہ 'واو' استدراک کے ساتھ ساتھ حال کے مضمون پر بھی محیط ہو جاتی ہے۔اس طرح کے مواقع پر ''لیکن'' کے ساتھ کچھ مقدر مفہوم کا اضافہ کر کے اسے بیان کیا گیا ہے، جیسا کہ مثال کے طور پر اس آیت میں:

فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ

''اس کے بعد بھی اگر وہ تمھیں جھٹلائیں تو کہہ دو کہ

وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ. (الانعام ۶: ۱۴۷)

تمھارے پروردگار کی رحمت میں بڑی وسعت ہے، لیکن (اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اُس کی دی ہوئی مہلت ختم ہوگئی تو) مجرموں سے اُس کا عذاب ٹالا نہ جا سکے گا۔''

۶۔ جب کہ

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا. (مریم ۱۹: ۸)

''اُس نے عرض کیا: پروردگار، میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا، جب کہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں خود بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ چکا ہوں۔''

'وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا'۔ یہ ''واو'' حال کے لیے آئی ہے اور اس کے لیے ''اور'' کا لفظ اب کچھ زیادہ فصیح نہیں رہا۔ ''البیان'' میں اس کے لیے موقع و محل کی مناسبت سے ایک سے زیادہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ زکریا علیہ السلام کو جب لڑکے کی بشارت دی گئی تو اسے مان لینے میں اُنھیں کچھ تردد لاحق ہوا کہ اُن کے ظاہری حالات اِس بشارت کے بالکل بھی موافق نہیں تھے۔ اُن کے اس تردد اور بظاہر ناممکن حالات کے بیان کو ان دونوں کے درمیان میں ''جب کہ'' کے الفاظ لا کر ہی بہتر طور پر ادا کیا جا سکتا تھا۔

۷۔ دراں حالیکہ

وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ. (النساء ۴: ۴۶)

''دراں حالیکہ اگر وہ 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا'، 'اِسْمَعْ' اور 'اُنْظُرْنَا' کہتے تو اُن کے لیے بہتر ہوتا اور موقع و محل کے مطابق بھی۔''

یہود میں سے کچھ لوگ دین میں طعن کرنے کے لیے رسول اللہ کی مجلس میں بعض لفظوں کو توڑ موڑ کر بولتے تھے۔ اُن کے بارے میں فرمایا ہے: 'وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا'۔ یہ ''واو'' بھی حال کے لیے ہے اور اس کا ترجمہ ''دراں حالیکہ'' کے لفظ سے کرنے میں یہ خوبی ہے کہ یہود کے اس گروہ کے لیے ایک مناسب اور بہتر رویے پر تشویق واضح کی جائے اور ان پر اس حسرت کا اظہار بھی کیا جائے کہ وہ تو کتاب کے حاملین ہونے کی وجہ سے اس بات کے سزاوار تھے کہ دین میں طعن کرنے کے بجائے آگے بڑھ کر اسے قبول کرنے والے ہوتے۔

۸۔ حقیقت یہ ہے کہ

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡٓا اِنۡ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجۡعَلۡ لَّکُمۡ فُرۡقَانًا وَّیُکَفِّرۡ عَنۡکُمۡ سَیِّاٰتِکُمۡ وَیَغۡفِرۡلَکُمۡ وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ. (الانفال ۸: ۲۹)

''ایمان والو، اگر تم خدا سے ڈرتے رہے تو وہ تمھارے لیے فرقان نمایاں کرے گا اور تمھارے گناہ تم سے جھاڑ دے گا اور تمھاری مغفرت فرمائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑے فضل والا ہے۔''

اس آیت میں مومنین سے تقویٰ کی شرط پر بعض انعامات کے وعدے فرمائے ہیں اور پھر تقویٰ کی طرف راغب کرنے اور ان وعدوں کو مزید مؤکد کرنے اور یہ بتانے کے لیے کہ اُس کی رحمتوں کو صرف ان وعدوں تک محدود نہ سمجھ لیا جائے، فرمایا ہے: 'وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ'۔ ''البیان'' میں حال کی اس ''واو'' کا ترجمہ ''حقیقت یہ ہے کہ'' کے الفاظ میں کیا گیا ہے جس سے یہ سارے مقاصد بڑی حد تک ادا ہو جاتے ہیں۔

بعض مقامات پر ''حقیقت یہ ہے کہ'' کے ساتھ کسی اور لفظ کا اضافہ بھی کیا گیا ہے اور بعض مواقع پر اس کے ساتھ کسی مقدر مفہوم کو بھی کھول دیا گیا ہے، جیسا کہ ذیل کی یہ آیتیں:

اُنۡظُرۡ کَیۡفَ یَفۡتَرُوۡنَ عَلَی اللّٰهِ الۡکَذِبَ وَکَفٰی بِهٖٓ اِثۡمًا مُّبِیۡنًا. (النساء ۴: ۵۰)

''انھیں دیکھو، (اپنے دعووں سے) یہ اللہ پر کیسا افترا باندھ رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ صریح گناہ ہونے کے لیے تو یہی کافی ہے۔''

یہاں ''اور'' کا لانا اس لیے بھی ضروری تھا کہ اُن کے جرم کی شناعت اور خدا کی طرف سے اُس کے اظہار میں پائی جانے والی مبادرت کو بھی ظاہر کیا جائے۔

وَعَلَی اللّٰهِ قَصۡدُ السَّبِیۡلِ وَمِنۡهَا جَآئِرٌ وَلَوۡ شَآءَ لَهَدٰىکُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ. (النحل ۱۶: ۹)

''اللہ تک سیدھی راہ پہنچاتی ہے، جب کہ راہیں ٹیڑھی بھی ہیں۔ (اب تمھیں اختیار ہے کہ جو راہ چاہے، اختیار کرو)، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ چاہتا تو تم سب کو (اُسی ایک راہ کی) ہدایت دے دیتا۔''

یہاں ''ورنہ'' اور اس سے پہلے مقدر جملہ اس لیے نکالا گیا ہے تاکہ پچھلی بات پر 'وَلَوۡ شَآءَ لَهَدٰىکُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ' کا عطف موزوں ہو سکے۔

۹۔ اور اس طرح

اَلَّذِیۡنَ یَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِیۡثَاقِهٖ وَیَقۡطَعُوۡنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنۡ یُّوۡصَلَ وَیُفۡسِدُوۡنَ

www.javedahmadghamidi.com

فِی الْاَرْضِ. (البقرہ۲: ۲۷)

''جو اللہ کے عہد کو اُس کے باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور اللہ نے جس چیز کے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اُسے کاٹتے ہیں، اور اس طرح زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔''

اس آیت میں اللہ کے عہد کو توڑنے اور رحمی رشتوں کو کاٹ دینے کا یہ نتیجہ بیان ہوا ہے کہ زمین میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'وَیُفْسِدُوْنَ' کے ''واؤ'' کا ترجمہ ''اور اس طرح'' کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔ اس کے بجاے اگر ''اور'' سے ترجمہ کیا جاتا تو فساد فی الارض پہلی دو باتوں کا نتیجہ ہونے کے بجاے تین کا تیسرا ہو کر رہ جاتا۔

یہی ''واؤ' ذیل کی آیت میں بھی آئی ہے:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ. (البقرہ۲: ۱۲۹)	''پروردگار، اور اُنھی میں سے تو اُن کے اندر ایک رسول اٹھا جو تیری آیتیں اُنھیں سنائے اور اُنھیں قانون اور حکمت سکھائے اور اس طرح اُنھیں پاکیزہ بنائے۔''

تزکیہ اصل میں کتاب و حکمت کی تعلیم کا لازمی نتیجہ ہے، نہ کہ اس سے الگ دین کا ایک مقصد۔ 'وَیُزَكِّیْهِمْ' کی ''واؤ'' کا ترجمہ بھی ''اور اس طرح سے'' کے الفاظ میں کریں تو دین اُس آمیزش سے بالکل پاک ہو جاتا ہے جو تزکیے کے نام پر غیر اسلامی نظریات کو اس میں داخل کر کے کی گئی ہے۔

''اور اس طرح'' کے الفاظ بعض مقامات پر نتیجے کی ''واؤ'' کے بجاے تفصیل کی ''واؤ'' کے لیے بھی لائے گئے ہیں، جیسا کہ اس آیت میں:

نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَّعِیْشَتَهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ. (الزخرف۴۳: ۳۲)	''دنیا کی زندگی میں ان کی معیشت کا سامان تو ان کے درمیان ہم نے تقسیم کیا ہے اور اس طرح تقسیم کیا ہے کہ ایک کے درجے دوسرے پر بلند رکھے ہیں''

۱۰۔ اور اس کے لیے

اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا. (العنکبوت۲۹: ۱۷)

''تم اللہ کو چھوڑ کر محض بتوں کو پوج رہے ہو اور اس کے لیے جھوٹ گھڑتے ہو۔''

سیدنا ابراہیم اپنی قوم سے فرماتے ہیں کہ تم اللہ جیسی ہستی کو چھوڑ کر بتوں کی پوجا کر رہے ہو جن کے بارے میں

واضح ہے کہ وہ تمھارے رزق پر کوئی اختیار نہیں رکھتے، چنانچہ اپنے اس شرک کو بنیاد فراہم کرنے کے لیے تم اُن کے بارے میں اپنی طرف سے باتیں گھڑ لیتے ہو۔ایک مقصد کو پانے اور اس کے لیے کوئی تدبیر کرنے کے لیے ''واؤ'' کا یہی استعمال ہے جسے ''البیان'' میں ''اور اس کے لیے'' کے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔

ذیل کی آیت میں بھی اس ''واؤ'' کا صحیح ادراک اور اسی لحاظ سے اس کا صحیح ترجمہ ایک اور طریقے سے اُس بدعت پر خط تردید پھیر دیتا ہے جو تزکیے کے نام پر، افسوس یہ کہ دین میں راہ پا گئی ہے:

هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ. (الجمعہ ۶۲:۲)

''اُسی نے امیوں کے اندر ایک رسول اُنھی میں سے اٹھایا ہے جو اُس کی آیتیں اُنھیں سناتا اور اُن کا تزکیہ کرتا ہے، اور اس کے لیے اُنھیں قانون اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

۱۱۔یعنی

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ. (البقرہ ۲:۵۳)

''اور یاد کرو جب ہم نے موسیٰ کو کتاب، یعنی (حق و باطل کے لیے) فرقان عطا فرمائی، اس لیے کہ (اس کے ذریعے سے) تم ہدایت حاصل کرو۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قرآن میں انبیاے کرام پر اترنے والی کتابوں کے متعلق یہ صراحت فرمائی گئی ہے کہ وہ اختلافات کو ختم کرنے کے لیے آتی ہیں۔تورات کی بھی یہی حیثیت تھی جسے یہاں 'اَلْفُرْقَان' کے لفظ اور تفسیر کے ''واؤ'' کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔اس لحاظ سے اس کا ترجمہ ''یعنی'' کے لفظوں میں کرنا، نہایت برمحل اور اصل مدعا کو بہت زیادہ واضح کر دینے والا ہے۔

ذیل کی یہ آیت بھی اس واو کو ''یعنی'' کے لفظ سے ادا کرنے کی ایک اچھی مثال ہے:

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِيْلَ. (آل عمران ۳:۴۸)

''اور اللہ اُسے قانون اور حکمت سکھائے گا، یعنی تورات و انجیل کی تعلیم دے گا۔''

چونکہ تورات میں زیادہ تر قانون بیان ہوا ہے اور انجیل میں حکمت کی باتیں، اس لیے انھیں بالترتیب قانون اور حکمت سے تعبیر کر لیا گیا ہے۔

تفسیر کے اس ''واؤ'' کو اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے تو قرآن کے قاری پر اس کے فہم کی ایک نئی دنیا کھل جاتی ہے،

جیسا کہ اس آیت میں[۳]:

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ. (الحجر۱۵: ۸۷)

''ہم نے تم کو سات مثانی، یعنی قرآن عظیم عطا کر دیا ہے۔''

بعض مقامات پر اس ''واؤ'' کو ''یعنی'' کے لفظ میں ادا کرنے سے وہ بے سود بحثیں بالکلیہ ختم ہو جاتی ہیں جو گروہی تعصّبات کی وجہ سے قرآن میں پیدا کر لی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ آیت:

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ. (المائدہ۵: ۱۵)

''تمھارے پاس یہ اللہ کی طرف سے ایک روشنی آ گئی ہے، یعنی ایک ایسی کتاب جو (دین و شریعت سے متعلق ہر چیز کو) واضح کر دینے والی ہے۔''

۱۲۔ ''واؤ'' کے دیگر ترجمے

۱۔ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ. (القصص۲۸: ۲۳)

''اور (اس کام کے لیے ہمیں ہی آنا پڑتا ہے، اس لیے کہ) ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں۔''

''البیان'' میں بعض مواقع پر یہ التزام کیا گیا ہے کہ ''واؤ'' کا ترجمہ ''اور'' کے لفظ میں کرتے ہوئے اُس کے ساتھ مقدر بات کو بھی ظاہر کر دیا جائے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے مدین کے کنویں پر کھڑی ہوئی عورتوں سے کہا: 'مَا خَطْبُكُمَا'۔ اُنھوں نے دو باتوں سے متعلق استفسار کیا: ایک یہ کہ تم عورتیں ہو کر یہاں کیوں آئی ہو؟ اور دوسرے یہ کہ اگر تم آ گئی ہو تو اب اپنے گلے کو روک کر کیوں کھڑی ہو؟ انھوں نے جواب میں کہا کہ ہم چرواہوں کی اِس بھیڑ میں اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں، اس لیے انھیں روک کر کھڑی ہیں۔ اور ہم خود یہاں اس لیے آئی ہیں کہ: 'وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ'۔ ''البیان'' کے ترجمے میں ''اور'' کا لفظ بتا رہا ہے کہ یہ سوال کے دو پہلوؤں میں سے ایک کا جواب ہے اور مقدر جملہ اُس مطابقت کو بیان کر رہا ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے سوال اور عورتوں کی طرف سے دیے گئے جواب کے درمیان میں پائی جاتی ہے۔

۲۔ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ. (الصافات۳۷: ۲۷)

''اُس وقت ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے کہ باہم سوال و جواب کریں۔''

پچھلی آیتوں میں آخرت کا منظر بیان ہوا ہے جب مجرموں اور اُن کے ساتھیوں اور اُن کے باطل معبودوں کو

۳؎ اس آیت کی تفصیل کے لیے ''البیان'' میں لکھی ہوئی تفسیر کی مراجعت کی جا سکتی ہے۔

دوزخ کا راستہ دکھا دیا جائے گا۔ 'وَ اَقۡبَلَ بَعۡضُھُمۡ' کی ''واو'' اِن آیتوں سے مفہوم ہونے والے ظرف کو بیان کر رہی ہے، چنانچہ ''البیان'' میں اس کا ترجمہ ''اُس وقت'' کے لفظوں میں کیا گیا ہے۔

۳۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ اَجۡرَمُوۡا کَانُوۡا مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یَضۡحَکُوۡنَ. وَاِذَا مَرُّوۡا بِھِمۡ یَتَغَامَزُوۡنَ. وَاِذَا انۡقَلَبُوۡۤا اِلٰۤی اَھۡلِھِمُ انۡقَلَبُوۡا فَکِھِیۡنَ. (المطففین ۸۳: ۲۹-۳۱)

''(وہ بھی دن تھے کہ) یہ مجرم ایمان والوں پر ہنستے تھے، جب اُن کے پاس سے گزرتے تو آنکھوں سے اشارے کرتے تھے، جب اپنے لوگوں میں پلٹتے تو مزے لیتے ہوئے پلٹتے تھے۔''

''البیان'' میں کئی مقامات پر ''واو'' کا ترجمہ چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہاں کلام اسے خود ہی ادا کر رہا ہوتا ہے۔ یہاں اسی لیے 'وَاِذَا مَرُّوۡا بِھِمۡ' اور 'وَاِذَا انۡقَلَبُوۡۤا' کے ''واو'' کا ترجمہ نہیں کیا گیا اور اگر ایسا کیا جاتا تو کلام کی روانی میں حد درجہ خلل آتا اور اس میں بننے والی تصویر ایک سے زائد تصویروں میں تبدیل ہو جاتی۔

۴۔ وَیَسۡتَعۡجِلُوۡنَکَ بِالۡعَذَابِ. (العنکبوت ۲۹: ۵۳)

''یہ تم سے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بعض اوقات یہ ''واو'' محض عطفِ جملہ کی ہوتی ہے، اس لیے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس کا لفظوں میں ترجمہ کیا جائے۔

''تنوین''

تنوین بھی ایک حرف ہے کہ اسے نحوی حضرات ''ن'' کا قائم مقام قرار دیتے ہیں۔ یہ اصل میں تنکیر کے لیے آتی ہے، مگر کلام عرب میں اس سے بعض دوسرے معانی کو بھی ادا کیا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک معنی تفخیم شان کا بھی ہے اور اس کا ترجمہ عام طور پر اس کے صرف ایک پہلو کے لحاظ سے کیا جاتا ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ''البیان'' میں تفخیم کی اس تنوین کا ترجمہ ہر جگہ ایک سا نہیں کیا گیا کہ مختلف مقامات پر اس کے مختلف پہلو مراد ہوا کرتے ہیں، مثلاً:

۱۔ عظمت

سُوۡرَۃٌ اَنۡزَلۡنٰھَا وَفَرَضۡنٰھَا وَاَنۡزَلۡنَا فِیۡھَاۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لَّعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ. (النور ۲۴: ۱)

''یہ ایک عظیم سورہ ہے جس کو ہم نے اتارا ہے اور اس کے احکام (تم پر) فرض ٹھیرائے ہیں اور اس میں نہایت واضح تنبیہات بھی اتاری ہیں تاکہ تم یاد رکھو۔''

یہاں 'سُوۡرَةٌ' کی تنوین اصل میں اس کی عظمت اور اہمیت کے اظہار کے لیے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور اس حذف سے مقصود یہ ہے کہ ساری توجہ خبر پر مرکوز ہو کر رہ جائے۔ مزید یہ کہ اگلے جملے، جیسا کہ اسے ہم نے اتارا ہے، اس کے احکام فرض ٹھیرا دیے ہیں، اس میں نہایت واضح تنبیہات اتار دی ہیں؛ ان سب سے بھی 'سُوۡرَةٌ' کے اس لفظ میں عظمت و اہمیت کا پہلو پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ ''البیان'' میں اس کا ترجمہ ''ایک عظیم سورہ'' کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔

۲۔ برتری

بَلۡ قَالُوۡۤا اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَ نَا عَلٰۤی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِهِمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ. (الزخرف ۴۳: ۲۲)

''ہرگز نہیں، بلکہ یہ تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک برتر طریقے پر پایا ہے اور ہم اُنھی کے قدم بہ قدم ٹھیک راستے پر چل رہے ہیں۔''

عرب کے لوگ صرف اس لیے شرک کو اپنا دین قرار نہیں دیتے تھے کہ یہ اُن کے باپ دادا کا طریقہ تھا، بلکہ وہ اُسے حق بھی سمجھتے تھے۔ آیت میں 'وَّاِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِهِمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ' کے الفاظ بھی یہی بات بتا رہے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہاں 'اُمَّةٍ' کی تنوین محض تنکیر کے لیے نہیں آئی، جیسا کہ عام طور پر مترجمین نے سمجھا ہے، بلکہ یہ اُن کے اُس زعم کو بیان کرنے کے لیے آئی ہے جس کے مطابق شرک ہی بہتر اور سب سے بڑھ کر دین تھا۔ یہی وجوہ ہیں کہ ''البیان'' میں اسے ''برتر'' کے لفظ میں ادا کیا گیا ہے۔

۳۔ خوبی

وَشَجَرَةً تَخۡرُجُ مِنۡ طُوۡرِ سَيۡنَآءَ تَنۡۢبُتُ بِالدُّهۡنِ وَصِبۡغٍ لِّلۡاٰكِلِيۡنَ. (المومنون ۲۳: ۲۰)

''اسی طرح وہ درخت بھی اگایا ہے جو طور سینا سے نکلتا ہے۔ وہ روغن لیے ہوئے اگتا ہے اور (روغن کی صورت میں) کھانے والوں کے لیے ایک اچھا سالن بھی۔''

یہاں خدا کی طرف سے کیے گئے ربوبیت کے بے مثل انتظام کو بیان کیا جا رہا ہے۔ امتنان کے اس پہلو کا لحاظ رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت محض روغن زیتون کے سالن ہونے کا بیان نہیں، بلکہ اِس سالن کے ایک بڑی اچھی نعمت ہونے کا بیان ہے۔ ان آیات کے مخاطبین کے بارے میں بھی ہم جانتے ہیں کہ اُن کے ہاں یہ روغن سالن کے طور پر استعمال ہوتا اور بہت زیادہ پسند کیا جاتا تھا اور اسے ایک مقوی غذا بھی قرار دیا جاتا تھا۔ 'صِبۡغٍ' کی تنوین اصل

میں اِس کی انھی خوبیوں کا بیان ہے، اور اسی وجہ سے ''البیان'' میں اس کا ترجمہ ''ایک اچھا سالن'' کیا گیا ہے۔

۴۔ ہولناکی

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا. (النساء۴:۳۰)

''اور یاد رکھو کہ جو لوگ ظلم و زیادتی کے ساتھ ایسا کریں گے، اُن کو ہم ضرور ایک سخت بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونک دیں گے۔''

قرآن میں عمل اور جزا کے درمیان میں مشابہت کی بہت سی مثالیں مذکور ہوئی ہیں۔ اس آیت میں اسی اصول پر فرمایا ہے کہ جو ظلم و زیادتی کرتے ہوئے نافرمانی کا ارتکاب کرے گا، اُسے ہم سزا بھی بڑی سخت اور ہولناک دیں گے۔ اس پہلو کا لحاظ کیا جائے تو 'نَارًا' کی تنوین سزا کے ہولناک ہونے کا بیان ہے اور اس لفظ کا ترجمہ ''ایک سخت بھڑکتی ہوئی آگ'' کرنا، بہت زیادہ موزوں ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۵۔ حسن و شان

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ. (الروم۳۰:۱۵)

''پھر جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہوں گے، وہ ایک شان دار باغ میں شاداں فرحاں رکھے جائیں گے۔''

جن لوگوں نے کفر اور تکذیب کی زندگی گزاری، اُن کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ آخرت کے روز عذاب میں پکڑے ہوئے ہوں گے۔ ان کے مقابلے میں جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، مذکورہ آیت میں اُن کے حسن انجام کا بیان فرمایا ہے۔ یہ حسن انجام محض ایک باغ کے بجائے کسی ایسے باغ کا دیا جانا ہی ہوسکتا ہے جو اپنی خوب صورتی اور شان میں بہت زیادہ بڑھا ہوا ہو۔ 'يُحْبَرُوْنَ' کے لفظ کی رعایت رہے تو بھی اِس باغ میں یہ وصف آپ سے آپ پیدا ہو جاتا ہے۔ 'رَوْضَةٍ' کی تنوین باغ کے اِسی وصف کا بیان ہے اور ''البیان'' میں اس کا ترجمہ اسی لیے ''شان دار باغ'' کے الفاظ میں ہوا ہے۔

۶۔ تکبیر

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ. (العنکبوت۲۹:۴۴)

''زمین اور آسمانوں کو خدا نے برحق پیدا کیا ہے۔ اس میں یقیناً بہت بڑی نشانی ہے ایمان والوں کے لیے۔''

مقصدِ حق کی تذکیر اور اُس کی طرف رہنمائی کے لیے قرآن میں عام طور پر تین بڑے دلائل کا ذکر کیا جاتا ہے: انفسی، تاریخی اور آفاقی۔ یہاں ان میں سے آخری کا ذکر فرمایا ہے۔ زمین و آسمان کی یہ تخلیق جس طرح قرآن میں ایک بڑی دلیل کے طور پر بیان ہوتی ہے، اسی طرح ہم جانتے ہیں کہ یہ واقعہ میں بھی بہت بڑی دلیل ہے۔ اس نظر سے دیکھا جائے تو 'لَاٰيَةً' کی تنوین اس دلیل کے بڑے ہونے ہی کا بیان ہے۔

یہ تنوین بعض اوقات تفخیم کے بجائے تحقیر کی ہوتی ہے، مگر ''البیان'' میں اس کا ترجمہ بھی ہر جگہ ایک سا نہیں کیا گیا:

۷۔ تصغیر

وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ. (الانبیاء ۲۱: ۴۶)

''تمھارے پروردگار کے عذاب کا کوئی جھونکا بھی انھیں چھو جائے تو پکار اُٹھیں گے کہ ہائے ہماری بدبختی! بے شک، ہم ہی ظالم تھے۔''

منکرین اللہ کے رسول کا مذاق اڑاتے، اُنھیں عذاب سے خبردار کیا جاتا تو جلدی مچاتے ہوئے خود اس عذاب کی طلب کرتے، یہاں تک کہ اس کے وقوع پر بے تکے سوال اُٹھا دیتے۔ اُن کے اس رویے پر فرمایا ہے کہ خدا کا عذاب تو بہت بڑی چیز ہے، اُنھیں اگر اس کا ذرا سا جھونکا بھی چھو جائے تو اُن کی یہ ساری مشیخت اور اکڑفوں ختم ہو کر رہ جائے۔ اس روشنی میں دیکھیں تو 'نَفْحَةٌ' کی تنوین یہاں اس جھونکے کا اپنی جسامت میں حقیر ہونا بیان کر رہی ہے۔ ''البیان'' میں اس کے لیے ''کوئی جھونکا بھی'' کے الفاظ لائے گئے ہیں اور دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ یہ تینوں الفاظ مل کر کس خوب صورتی سے یہ سارا معنی ادا کر رہے ہیں۔

۸۔ حقارت

وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا. (الجن ۷۲: ۶)

''اور یہ بھی کہ (انسان کچھ پہلے ہی سرکش تھے، پھر) انسانوں میں سے کچھ احمق ہمارے اِن جنوں میں سے کچھ شریروں کی دہائی دیتے رہے تو اِنھوں نے اُن کی سرکشی بڑھا دی۔''

اس آیت میں انسانوں کی یہ حماقت بیان ہوئی ہے کہ وہ جنوں کی دہائی دیتے رہے اور اس حماقت کا یہ نتیجہ بیان ہوا ہے کہ جن چونکہ خود شریر تھے، اس لیے انھوں نے انسانوں کی سرکشی میں اور اضافہ کر دیا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو آیت میں 'رِجَالٌ' کی تنوین دونوں جگہ تحقیر کے خاص پہلو، یعنی حقارت کے لیے آئی ہے۔ البتہ، یہ حقارت 'رِجَالٌ

مِّنَ الۡاِنۡسِ ‘میں انسانوں کی حماقت اور ’رِجَالٍ مِّنَ الۡجِنِّ ‘میں جنوں کی شرارت پر پیدا ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ’’البیان‘‘ میں اس کے لیے ’’احمق‘‘ اور ’’شریر‘‘ کے دو مختلف الفاظ لائے گئے ہیں۔

ذیل کی آیت میں تحقیر کے دونوں پہلوا کٹھے ہو گئے ہیں، یعنی کسی شے کا اپنی جسامت اور اپنی حیثیت، دونوں میں معمولی درجے کا ہونا اور ’’البیان‘‘ میں انھی دو پہلوؤں کو ’’ذراسی‘‘ کے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے:

خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيۡمٌ مُّبِيۡنٌ. (النحل ۱۶:۴)

’’اُس نے انسان کو ایک ذراسی بوند سے پیدا کیا تو دیکھتے ہو کہ یکایک وہ ایک کھلا ہوا حریف بن کر اٹھ کھڑا ہوا ہے۔‘‘

بعض اوقات یہ تنوین تقلیل اور تکثیر کے مضمون کو بھی بیان کرتی ہے:

۹۔ قلت

فَلَوۡلَا نَفَرَ مِنۡ كُلِّ فِرۡقَةٍ مِّنۡهُمۡ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوۡا فِي الدِّيۡنِ. (التوبہ ۹:۱۲۲)

’’مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ اُن کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ نکلتے تا کہ دین میں بصیرت پیدا کرتے۔‘‘

دور دراز کے علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ تعلیم و تربیت کی غرض سے سب کے سب مدینہ کے لیے نکل کھڑے ہوتے اور نہ دین اسلام کا یہ مزاج ہی ہے کہ وہ ان سب کے نکل آنے پر اصرار کرتا۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ ایسا کیوں نہ ہوا کہ اُن کی ہر جماعت میں سے کچھ لوگ ہی نکلتے۔ آسانی سے سمجھ لیا جا سکتا ہے کہ ’طَآئِفَةٌ‘ کی تنوین یہاں تقلیل کے لیے آئی ہے جسے ’’کچھ لوگ‘‘ کے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔

۱۰۔ کثرت

فَاٰمَنَتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡۢ بَنِيۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ وَكَفَرَتۡ طَّآئِفَةٌ. (الصّف ۶۱:۱۴)

’’چنانچہ بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لایا اور ایک بڑا گروہ اپنے کفر پر جما رہا۔‘‘

مسلمانوں سے فرمایا ہے کہ وہ اللہ کے مددگار بنیں گے تو وہ بھی لازماً اُن کی مدد کرے گا، جیسا کہ ایک زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری اللہ کے مددگار رہنے اور اس کے باوجود کہ بنی اسرائیل میں سے بہت تھوڑے لوگ ایمان لائے تھے، اللہ نے اُنھیں ان کے دشمنوں پر غالب کیا۔ اس سیاق میں اور اس کے ساتھ اگر سورہ کے مرکزی مضمون کو بھی سامنے رکھا جائے تو آیت میں اول الذکر ’طَآئِفَةٌ‘ کی تنوین تو تقلیل کے لیے ہے، مگر ثانی الذکر

'طَآئِفَةٌ' کی تنوین تکثیر کے لیے آئی ہے، چنانچہ اس کا ترجمہ ایک ''بڑا گروہ'' کیا گیا ہے۔

تنوین سے کسی شے کی تعمیم بھی مراد لی جاتی ہے:

۱۱۔ تعمیم

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ. وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ. وَشَاهِدٍ وَّ مَشْهُوْدٍ. (البروج ۸۵: ۱-۳)

''برجوں والا آسمان گواہی دیتا ہے اور وہ دن بھی جس کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے، اور (دنیا میں) ہر دیکھنے والا، (اگر وہ عبرت کی نگاہ سے دیکھے) اور جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے۔''

یہاں قیامت پر استدلال کیا جا رہا ہے اور اس کے لیے آسمان میں کیے گئے نگرانی کے انتظام اور خود قیامت کے دن کو پیش کیا ہے۔ اسی طرح آفاق میں موجود بے شمار نشانیوں اور اُن سے عبرت حاصل کرنے والے بہت سے لوگوں کا بھی ذکر کیا ہے کہ یہ سب گواہی دیتے ہیں کہ قیامت واقع ہو کر رہے گی۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو 'شَاهِدٍ' اور 'مَشْهُوْدٍ' کی تنوین اصل میں تعمیم کی ہیں اور اسی وجہ سے ان کا ترجمہ ''ہر دیکھنے والا'' اور ''جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے'' کے الفاظ میں ہوا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تنوین کراہت کے لیے بھی آتی ہے اور اس کراہت اور ناپسندیدگی کے بھی ایک سے زائد پہلو مراد ہوا کرتے ہیں:

۱۲۔ اِعراض

قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ. (المائدہ ۵: ۱۰۲)

''تم سے پہلے ایک قوم نے اِسی طرح کی باتیں پوچھیں، پھر اُنھی کے منکر ہو کر رہ گئے تھے۔''

یہود کے بارے میں فرمایا ہے کہ ایسا بھی ہوا کہ اُنھوں نے خدا کا حکم سن کر لیت و لعل سے کام لیا اور اُس پر بے جا سوالات پوچھنا شروع کر دیے اور جب خدا کی طرف سے جواب دیا گیا تو پھر بھی ماننے کے بجاے اُن کا انکار کر دیا۔ یہاں یہود کی قوم کے لیے محض 'قَوْمٌ' کا لفظ لایا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ متکلم اُن سے اِعراض اور اپنی بے زاری کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ ''ایک قوم'' کے الفاظ اصل میں اُسی اعراض کا بیان ہیں۔

۱۳۔ نفرت

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ. (النساء ۴: ۴۷)

''اے وہ لوگو، جنھیں کتاب دی گئی، اُس چیز کو مان لو جو ہم نے اُن چیزوں کی تصدیق میں اتاری ہے جو خود تمھارے پاس موجود ہیں۔ مان لو، اس سے پہلے کہ ہم چہرے بگاڑ دیں اور اُن کو پیچھے کی طرف الٹ کر برابر کر دیں۔''

اہل کتاب کو وعید سنائی جارہی ہے کہ انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو استعمال نہ کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے، اس لیے اُن کے چہروں پر اب آنکھ اور کان وغیرہ کی گویا ضرورت نہیں رہی اور بہتر یہی ہے کہ ان چہروں کو بالکل سپاٹ بنا دیا جائے۔ یہاں اُن کے چہروں کے لیے 'وجوھم' نہیں، بلکہ 'وُجُوْهًا' کہا ہے اور اس تنوین سے مقصود یہ ہے کہ متکلم کو اُن سے صرف بے زاری نہیں، بلکہ اس قدر نفرت ہے کہ اُن کا ذکر کرنا بھی اُسے روا نہیں۔ ''البیان'' میں اسی نفرت کو ادا کرنے کے لیے چہرے کے ساتھ کسی اور لفظ کو استعمال کرنے کے بجائے محض ''چہرے'' کا لفظ لایا گیا ہے۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

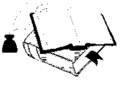

محمد ذکوان ندوی

تفسیر اور تذکیر کا فرق

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

قرآن مجید سے ذِکر و نصیحت کا فائدہ حاصل کرنے کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ یہ مفروضہ ہے کہ ـــــ قرآن ایک مشکل کتاب ہے۔ اُس کو سمجھنا عام لوگوں کا کام نہیں۔ یہ صرف علما کا مقام ہے کہ وہ قرآن کو سمجھ کر پڑھیں اور اُس سے استفادہ کر سکیں۔

اِس قسم کا مفروضہ قرآن کے تذکیری اور تفسیری مطالعے میں فرق نہ کرنے کی بنا پر پیدا ہوا ہے۔ اصل یہ ہے کہ قرآن سے استفادہ کرنے کی دو سطحیں ہیں: ایک ہے تلاوت برائے تذکیر، اور دوسری ہے تلاوت برائے تفسیر۔ قرآن میں بار بار ارشاد ہوا ہے کہ تذکیر کے لیے اُسے پوری طرح موزوں بنا دیا گیا ہے: 'وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ'۔ قرآن کے مطابق، تذکیر کے لیے اصلاً 'تَقْوٰی' (الحاقہ ۶۹: ۴۸) اور 'اِنَابَت' (غافر ۴۰: ۱۳) جیسی داخلی صفات درکار ہیں۔ البتہ تفسیر کے لیے، بلا شبہ یہ ضروری ہے کہ آدمی اپنے اندر مطلوب علمی استعداد پیدا کرے۔

اِس معاملے میں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اِس باب میں خود قرآن مجید کا اپنا بیان کیا ہے؟ قرآن کا مطالعہ واضح طور پر بتاتا ہے کہ یہ مفروضہ بالکل بے اصل ہے۔ قرآن نے متعدد مقام پر بار بار اِس بات کی صراحت فرمائی ہے کہ وہ اپنے اصل مقصد کے بیان و ابلاغ کے اعتبار سے بالکل ایک واضح کتاب ہے۔ وہ بنیادی مقصد یہ ہے کہ خدا ایک ہے، وہی عبادت کے لائق ہے اور انسانوں کو ایک دن اپنے ابدی مستقبل (جنت یا جہنم) کا آخری

فیصلہ سننے کے لیے اُس کے حضور میں پیش ہونا ہے۔

اِسی کے ساتھ قرآن میں بار بار یہ اعلان کیا گیا ہے کہ قرآن نصیحت کے لیے پوری طرح موزوں بنا دیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک ہی سورہ میں چار مرتبہ بہ تکرار اِس حقیقت کو دہرایا گیا ہے: 'وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ، فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ' (القمر ۵۴: ۱۷، ۲۲، ۳۲، ۴۰)، یعنی ہم نے اِس قرآن کو یاددہانی کے لیے نہایت موزوں بنا دیا ہے۔ پھر کیا ہے کوئی یاددہانی حاصل کرنے والا؟

اِس کے علاوہ، ایک معمولی فرق کے ساتھ یہی بات قرآن میں مزید دو بار حسب ذیل الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

☆ 'فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا' (مریم ۱۹: ۹۷)، یعنی ہم نے اِس قرآن کو تمھاری زبان میں اِسی لیے سہل اور موزوں بنا دیا ہے تاکہ تم اُن لوگوں کو اِس کے ذریعے سے بشارت دو جو خدا سے ڈرنے والے ہیں، اور اِن ہٹ دھرم لوگوں کو اِس کے ذریعے سے خبردار کر دو۔

☆ 'فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ' (الدخان ۴۴: ۵۸)، یعنی ہم نے اِس قرآن کو تمھاری زبان میں نہایت موزوں بنا دیا ہے تاکہ وہ اِس سے یاددہانی حاصل کریں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اِسی طرح ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوا ہے: 'وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ. قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ' (الزمر ۳۹: ۲۷-۲۸)، یعنی ہم نے اِس قرآن میں لوگوں کی تذکیر کے لیے ہر قسم کی تمثیلیں بیان کر دی ہیں تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ وہ ایک عربی قرآن کی صورت میں ہے جس کے اندر کوئی ٹیڑھ نہیں پائی جاتی۔

اِن آیات سے یہ حقیقت پوری طرح مبرہن ہو جاتی ہے کہ تذکیر کے لیے قرآن بالکل واضح اور آسان کتاب ہے۔ اِسی کے ساتھ قرآن میں ہرگز کسی قسم کی کوئی فلسفیانہ پیچیدگی نہیں پائی جاتی۔ وہ فصیح و بلیغ زبان، اور ایسے فطری اور دل نشیں اسلوب میں نازل کیا گیا ہے جس سے اُس کا اصل مقصد ہر جگہ کسی ابہام کے بغیر پوری قطعیت کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے۔

قرآن کی زبان و بیان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن آیات میں 'تَيْسِيْر' کا مطلب معروف معنوں میں صرف کتاب اللہ کا ''آسان'' ہونا نہیں، بلکہ اِس سے مراد اپنے مقصد کے اِبلاغ کے لیے قرآن کا پوری طرح موزوں ہونا ہے، یعنی قرآن اپنے الفاظ و معانی اور اپنے اصل پیغام کی ترسیل کے اعتبار سے، پوری طرح انسانی فطرت اور اُس کی نفسیات کے مطابق ہے۔ وہ عین اُسی خالق کا کلام ہے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ انسان اور قرآن،

دونوں ایک ہی خداے رحمان ورحیم کی رحمتوں کا ظہور ہیں (الرحمٰن ۵۵: ۱-۳)۔ انسان اور قرآن، دونوں ایک دوسرے کا مثنّٰی (العنکبوت ۲۹: ۴۹) ہیں۔ دونوں کے درمیان مذکورہ قسم کے کسی فرق کا وجود عقل و فطرت، دونوں اعتبار سے ممکن نہیں۔

عربی مبین اور متعلق علوم پر عالمانہ نظر

قرآن کا مخاطَب چونکہ انسان ہے، اور ظاہر ہے کہ انسان ایک مکمل وجود کا نام ہے۔ وہ اپنے آپ میں پوری ایک کائنات ہے۔ ایسی حالت میں یہ ایک فطری بات ہے کہ قرآن میں اپنے مقصد کی توضیح وتبیین کے ضمن میں دیگر آفاقی اور انفسی حقائق کا تذکرہ بھی موجود ہو[1]۔ اِس لیے ضروری ہوگا کہ تذکیریات کے علاوہ، جو شخص قرآن کا گہرا علمی مطالعہ کرنا چاہے، وہ انسانی علوم، مثلاً تاریخ، نفسیات اور اجتماعیات جیسے موضوع پر بھی گہری نظر رکھتا ہو۔ اِس طرح اُس کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ وہ قرآن کے 'ظاہر' کے ساتھ اُس کے 'باطن' تک پہنچنے کے لیے تدبر قرآن کے علمی تقاضوں کو پورا کر سکے۔

اِس معاملے میں بنیادی چیز قرآن کی زبان وبیان پر عالمانہ نظر ہے۔ ''قرآن کا فہم اب اِس زبان (عربی مبین) کے صحیح علم اور اِس کے صحیح ذوق ہی پر منحصر ہے، اور اِس میں تدبر اور اِس کی شرح وتفسیر کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اِس زبان کا جید عالم اور اِس کے اسالیب کا ایسا ذوق آشنا ہو کہ قرآن کے مدعا تک پہنچنے میں کم از کم اُس کی زبان اُس کی راہ میں حائل نہ ہو سکے[2]۔''

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اِس کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا: 'أعربوا القرآن'[3]۔ اِسی طرح خلیفۂ ثانی عمر بن الخطاب نے فرمایا: 'تعلّموا العربیة، کما تعلّموا حفظَ القرآن' (مصنّف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۹۳۲۹)، یعنی تم عربی مبین کی تعلیم اُسی طرح حاصل کرو، جس طرح تم خود قرآن کی تعلیم حاصل کرتے ہو۔ مذکورہ روایات میں 'إعراب' اور 'العربیة' سے مراد اصلاً اُس عربی مبین کی تعلیم ہے جس میں قرآن نازل ہوا اور جس میں

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مناهل العرفان للزرقاني کا باب إعجاز القرآن و ما یتعلق به، ۲/ ۲۱۲۔

[2] میزان، جاوید احمد غامدی ۱۶۔

[3] مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۴۳۶۶۔

نزولِ قرآن کے وقت قبیلۂ قریش کے لوگ کلام کرتے تھے۔[4]

قرآن کی زبان و بیان میں عالمانہ درک حاصل کیے بغیر جو شخص قرآن پر رائے زنی کرے، اُس کے بارے میں سخت اندیشہ ہے کہ وہ اِس پیغمبرانہ تہدید کا مصداق قرار پائے: 'من قال في القرآن بغير علم، فليتبوأ مقعده من النار' (ترمذی، رقم ۲۹۵۰)، یعنی علم کے بغیر جو شخص قرآن کے باب میں رائے دے، اُسے چاہیے کہ وہ جہنم میں اپنا ٹھکانا بنالے۔

قرآن کی زبان و بیان پر، بلاشبہ بہت قابل قدر کام ہو چکا ہے۔ تاہم بعد کے زمانے میں مولانا حمید الدین فراہی (وفات: ۱۹۳۰) اور اُن کے تلامذہ نے اِس موضوع پر انتہائی اہم اور انقلابی کام کیا ہے۔ قرآن کے طلبہ اِس سے بہت کچھ اخذ و استفادہ کر سکتے ہیں۔

قرآن کی عربی معلّٰی کے ذوق کی آب یاری کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کے طلبہ دو بنیادی کام ضرور کریں: ایک ہے ــــــ تلاوتِ قرآن کے خصوصی اہتمام اور اُس کے دعوتی اور تذکیری مطالعے کے ساتھ، زبان و بیان کے اعتبار سے قرآن پر مسلسل غور و فکر اور مختلف زاویوں سے اُس کے اسالیب کا گہرا مطالعہ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن کی زبان و بیان کا خود اُس سے بڑا اور دوسرا کوئی ماخذ نہیں۔ یہ گویا مطالعۂ قرآن کا وہی طریقہ ہوگا جس کو ادبی ریفرینس میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے:

برائے پاکی شعرے، شب بہ روز آرد[5]

یہ اِسی دوسری نوعیت کا گہرا مطالعۂ قرآن تھا جس میں بعض سلف صالحین کے کئی کئی برس صرف ہو جاتے تھے۔ مثلاً چوتھی صدی ہجری کے مشہور عالم اور محدث ابو العباس بن عطاء البغدادی کو اِسی قسم کے ایک ختم قرآن میں کئی سال گزر گئے: 'وبقي في ختمة مفردة بضع عشرة سنة، يتفهم ويتدبر'[6]۔

مختلف زاویوں سے قرآن مجید پر یہی وہ گہرا تدبر تھا جس میں خلیفۂ ثانی عمر بن الخطاب اور اُن کے بیٹے عبد اللہ بن عمر کو محض سورۂ بقرہ کی تکمیل میں کئی برس کا طویل عرصہ گزر گیا تھا۔[7] یہی وجہ تھی کہ ''ختم قرآن'' کے مروجہ طریقوں کے

---

۴ الإتقان للسيوطي ۴۵۳/۳۔

۵ ''ایک شعر کی تہذیب میں بسا اوقات رات گزر جاتی اور دن نکل آتا ہے۔''

۶ سير أعلام النبلاء ۲۵۶/۱۴۔ صفة الصفوة لابن الجوزي ۵۳۳/۱۔ تاريخ بغداد للبغدادي ۲۶/۵۔

۷ الجامع لأحكام القرآن للقرطبي ۴۰/۱۔ الإتقان للسيوطي ۱۷۶/۴۔ الطبقات الكبرىٰ لابن سعد ۱۶۴/۴۔

برعکس، اصحاب رسول کے درمیان اِس عمل کو عظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا کہ ایک شخص قرآن کی صرف دو سورتیں (البقرہ، آل عمران) سیکھ لے: 'يقول أنس رضي الله عنه: كان الرجل إذا قرأ البقرة و آل عمران، جلّ في أعيننا[8]'۔ اصحاب رسول اور سلف صالحین کے حالات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ قرآن کے علم و عمل کے بغیر مجرد تلاوت کا تصور اُن کے درمیان اجنبی تھا۔[9]

عربی قرآن کے ذوق کی آب یاری کے لیے قرآن کے بعد اِس مقصد کے لیے احادیث و آثار کا مطالعہ بہت مفید ہے۔ خاص طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں، تمثیلات اور اپنے اصحاب کے ساتھ آپ کی گفتگو میں عموماً روایت باللفظ کی بنا پر اِس عربی مبین کا بہت بڑا خزانہ جمع ہو گیا ہے۔ قرآن کا ایک طالب علم اگر اپنی زندگی میں اِن ماثور دعاؤں کو شعور و ذوق کے ساتھ حرزِ جاں بنا سکے تو زبان و بیان کے حسن بے پایاں کے ساتھ وہ اُس کے لیے فکر و عمل کی تاریکی سے نکل کر ہدایت و معرفت کی روشنی حاصل کرنے کا ایک بے مثل ذریعہ ثابت ہو گا۔[10]

عربی قرآن کے ذوق کی آب یاری کے لیے قرآن کے طلبہ کو دوسرا جو کام کرنا چاہیے، وہ مولانا حمید الدین فراہی کی کتابوں، خاص طور پر ''مفردات القرآن'' اور ''اسالیب القرآن'' (رسائل في علوم القرآن) کا سبقاً سبقاً گہرا مطالعہ ہے۔ اِسی طرح اہل علم کا تجربہ ہے کہ اِس معاملے میں سرسید، شبلی، حالی اور خود فراہی کے استاذ ''اصمعیِ زمانہ'' مولانا فیض الحسن سہارن پوری (وفات: ۱۸۸۷ء) کی کتب، خاص طور پر 'رياض الفيض على المعلقات السبع'، وغیرہ کا مطالعہ اُس ادبی ذوق کے لیے صیقل کے ہم معنی ہے جو عربی قرآن کا ذوق آشنا بنانے کے لیے بے حد ضروری ہے۔[11]

۸؎ مجموع الفتاوٰی لابن تیمیة ۳۳۱/۱۳۔

۹؎ مجموع الفتاوٰی لابن تیمیة ۱۰۸/۱۵۔ سير أعلام النبلاء للذهبي ۴۹۰/۱۔

۱۰؎ اِن دعاؤں کے بہت سے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اِس کے علاوہ، کتب احادیث کا باب ''كتاب الدعوات''، خاص طور پر سنن الترمذی کا مذکورہ باب نسبتاً زیادہ وسیع ہے۔ اِس معاملے میں الأذكار (النووی)، جامع صحيح الأذكار (الالبانی) اور الجامع الصحيح للأدعية و الأذكار (صہیب عبد الجبار) بہت جامع ہے۔ ۶۲۳ صفحات پر مشتمل یہ آخر الذکر مجموعۂ دعا اور دعا سے متعلق الجامع الصحيح للسنن و المسانيد (كتاب العبادات) کی تقریباً تمام صحیح روایات کا بہترین خزانہ ہے۔

۱۱؎ آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عالم ابن قیم الجوزیہ (وفات: ۱۳۱۰ء) کے یہاں بھی اِس اعتبار سے انتہائی بیش قیمت مواد پایا جاتا ہے۔ دوسری چیزوں کے علاوہ، فہم قرآن میں معاون اعلیٰ ادبی ذوق کی آب یاری کے لیے اُن کی کتابوں کا مطالعہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

آخری بات

آخر میں دوبارہ عرض ہے کہ قرآن کے تذکیری اور تفسیری مطالعے میں فرق انتہائی ضروری ہے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ اِس معاملے کو اِطلاق کی زبان میں بیان کر کے فہم قرآن کے لیے ''علوم'' کی تعداد میں غیر ضروری اضافہ کرنا عملاً قرآن سے دور کرنے کے ہم معنی ثابت ہوا ہے۔

یہاں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اِس قسم کے جن ''علوم'' کو تذکیر بالقرآن کے لیے لازمی قرار دیا جاتا ہے، وہ خود اِس بات کے محتاج ہیں کہ قرآن کی بارگاہ سے وہ اپنے لیے سند تصدیق حاصل کریں۔ قرآن کی تصدیق کی شرط پر ہی وہ اِس قابل ٹھیریں گے کہ وہ فہم قرآن کے لیے معاون ثابت ہو سکیں۔

''قرآن نصیحت کے لیے ایک آسان ترین کتاب ہے'' ـــــ خدا کے اِس مسلسل فرمان کے باوجود مذکورہ قسم کے بے اصل مفروضات کی بنا پر قرآن آج امت کے درمیان ایک مشکل ترین کتاب بنا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اب عملاً صرف ''تلاوت برائے ثواب'' کے مروجہ تصور کا موضوع بن کر رہ گیا ہے، نہ کہ تلاوت برائے تدبر کے اصل تصور کا موضوع۔ جلیل القدر تابعی حسن البصری (وفات: ۷۲۸ء) کے الفاظ میں، آج عملاً صورت حال یہ ہے کہ جو قرآن تدبر و عمل کے لیے نازل کیا گیا تھا، لوگوں نے صرف اُس کی تلاوت ہی کو عمل کا درجہ دے دیا ہے[۱۲]۔ تلاوت کا مطلوب ـــــ ذِکر و نصیحت، اور اُس کا طریقہ ـــــ تدبر و تفکر اب امت کے درمیان تقریباً اجنبی بن چکا ہے، حتیٰ کہ 'حق تلاوت' اور تدبر کا یہ مطلوب طریقہ خود قرآن کی دھوم مچانے والے بہت سے لوگوں کے درمیان بھی اتنا ہی اجنبی ہے، جتنا کہ وہ اُس سے بے خبر لوگوں کے درمیان اجنبی بنا ہوا ہے۔

امت مسلمہ کے بگاڑ کا اصل سبب کتاب اللہ سے اِسی فکری اور عملی تعلق کا فقدان ہے۔ اب آخری وقت آ گیا ہے

بلاشبہ مفید ہوگا۔ خاص طور پر ملاحظہ ہوں اُن کی کتابیں ـــــ الأمثال في القرآن، التبيان في أقسام القرآن، التبيان في أيمان القرآن، بدائع الفوائد، البدائع في علوم القرآن اور بدائع التفسير، وغیرہ۔ آخر الذکر دو کتابیں حسن ترتیب اور عمدہ گیٹ اَپ کے ساتھ یسری السید محمد اور صالح احمد الشامی کی تحقیق و تخریج سے چھپ چکی ہیں۔ بدائع التفسير (مطبوعہ دار ابن الجوزی) ۳ ضخیم مجلدات (صفحات: ۱۴۳۰) پر مشتمل ایک وسیع موسوعہ (انسائکلو پیڈیا) کی حیثیت رکھتی ہے۔

۱۲ نزل القرآن لِيُتدبر ويُعمل به، فاتخذوا تلاوته عملاً (تلبيس إبليس لابن الجوزي: ۱۰۹؛ اقتضاء العلم والعمل للبغدادي: ۷۶)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کہ فہم قرآن کے دوسرے موانع کو دور کرنے کے علاوہ، اُس کے تذکیری اور تفسیری فرق کو واضح کر کے خدا اور اُس کے بندوں کے درمیان حائل ہونے والی فکری بنیادوں کو مکمل طور پر ڈھا دیا جائے، تاکہ لوگ اللہ کی کتاب سے رہنمائی حاصل کریں اور خدا کا کلام براہ راست اپنے ماننے والوں کی قیادت کرے۔قرآن دنیا میں صراط مستقیم پر چلنے کے لیے مشعل راہ ہو، اور آخرت میں وہ اُن کے لیے 'رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً' کی ابدی بادشاہی میں داخلے کی بشارت بن سکے۔

[۱۰/ جنوری ۲۰۱۸ء]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

خورشید احمد ندیم

تنقیدی شعور

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

فکر و نظر کی دنیا میں کوئی بات حرف آخر نہیں ہوتی۔ یہ غور و فکر کا مسلسل عمل ہے جو کسی سماج کے زندہ ہونے کی علامت ہے۔ اس سے جہاں روایت پر نئی نسل کا ایمان پختہ ہوتا ہے، وہاں اسے یہ موقع ملتا ہے کہ نئے دریافت شدہ حقائق کو بھی اپنے افکار کا حصہ بناتے رہیں۔ تاہم سوچ بچار کا یہ عمل اسی وقت نتیجہ خیز ہوتا اور مثبت ارتقا کو یقینی بناتا ہے جب یہ تنقیدی شعور سے بہرہ مند ہو۔

تنقیدی شعور فکری ارتقا کو ایک نظم کا پابند بناتا ہے۔ اس کے آداب متعین کرتا ہے۔ وہ کسی سیاق و سباق کو پیش نظر رکھتا ہے۔ ناقد کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس پہلو پر تنقید کر رہا ہے۔ سماج بھی تنقید کو اسی تناظر میں دیکھتا ہے۔ لوگوں کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ کسی موقف کو پرکھ سکیں۔ ان پر اس کے مثبت پہلو واضح ہوں اور ساتھ منفی بھی۔ یوں یہ تنقید ایک مثبت عمل بنتی اور معاشرے کو فکری سرمایے سے مالا مال کر دیتی ہے۔ اس سے مکالمے کا کلچر پیدا ہوتا ہے۔ مناظرے کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے، جو تلاش حق سے زیادہ برتری کی منفی نفسیات کو فروغ دیتا ہے۔

یہ تنقیدی شعور دو امور کے تابع ہے: فکری پختگی اور علمی دیانت۔ علم پختہ نہ ہو تو زیر تنقید موقف کی درست تفہیم نہیں ہوتی۔ ناقد تنقید کو سیاق و سباق کا پابند نہیں رکھ سکتا۔ اس طرح تنقید کے نام پر رطب و یابس کا ایک مجموعہ وجود میں آتا ہے۔ اس سے فکری پراگندگی تو پیدا ہو سکتی ہے، نظری ارتقا نہیں۔ دیانت نہ ہو تو تنقید کے نام پر بہت سی ایسی باتیں

زیرتنقید فکر یا شخصیت سے منسوب کر دی جاتی ہیں جو اس کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں ہوتیں۔ بایں ہمہ، ادھوری بات بتائی جاتی ہے اور دوسری باتوں کو چھپایا جاتا ہے۔

تنقیدی شعور اگر پختہ اور آداب کا پابند ہو تو کس طرح فکری ارتقا کا سامان کرتا ہے، مسلمانوں کی علمی روایت اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ مسلمانوں کے علمی ذخیرے میں بہت سی روایات ''احادیث پیغمبر'' کے عنوان سے شامل ہیں جو صریحاً قرآن مجید اور عقل سلیم کے خلاف ہیں۔ اسی ذخیرے میں اُن اہل علم کی تحقیق بھی موجود ہے جنھوں نے دلائل کے ساتھ بتایا ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایسی روایات کا انتساب ثابت نہیں۔ اس کے باوجود ایسی روایات کو پذیرائی ملتی اور وہ مسلسل بیان ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً امام غزالی کی ''احیاء علوم الدین'' ہے۔ اس کتاب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر مسلمانوں کا تمام تر علمی سرمایہ دریا برد ہو جائے اور یہ کتاب محفوظ رہ جائے تو بھی اطمینان رکھنا چاہیے کہ کچھ ضائع نہیں ہوا۔ یہ کتاب بے بنیاد روایات سے مملو ہے۔ اس پر امام ابن تیمیہ کی تنقید موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ ابن جوزی نے ''الاحیاء'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں ان روایات کی کم زوری کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود امام غزالی کے سند سے ایسی روایات مسلسل بیان ہو رہی ہیں۔

جدید ذہن کا آدمی جب ایسی روایات کو پڑھتا ہے تو اس کے خانۂ دل میں تشکیک کی کھڑکی کھل جاتی ہے۔ اہل علم تو اس حقیقت کو پالیتے ہیں کہ چند روایات کے مشتبہ ہونے سے یہ حقیقت متاثر نہیں ہوتی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت دین کا مستقل ماخذ ہے جس کی بنیاد چند راویوں کی سند پر نہیں۔ اس کی اساس امت کے تواتر پر ہے۔ مزید یہ کہ محدثین کی غیر معمولی محنت اور عرق ریزی نے سنگ ریزوں اور جواہر کو اس طرح الگ کر دیا ہے کہ کوئی کم زور بات دین میں جگہ نہیں بنا سکتی۔ سب لوگ، مگر رسوخ فی العلم نہیں رکھتے۔ چونکہ یہ روایات اس کے باوجود مسلسل بیان ہوتی ہیں، اس لیے تشکیک کی کھڑکی بند نہیں ہوتی۔ جب کچھ لوگ اس تنقیدی پہلو کو نظر انداز کرتے ہیں تو وہ چند کم زور روایات کو بنیاد بنا کر سنت کا بطور ماخذ دین انکار کر دیتے ہیں۔

بیسویں صدی میں اس نقطۂ نظر کو ایک حد تک پذیرائی ملی۔ پاکستان میں غلام احمد پرویز صاحب نے اسے بہت شد و مد کے ساتھ پیش کیا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور بعض دوسرے اہل علم نے اس نقطۂ نظر پر نقد کیا۔ یہ بحث اس تنقیدی شعور کی بہت اچھی مثال ہے جو معاشرے کے مثبت فکری ارتقا کو یقینی بناتی ہے۔ پرویز صاحب کی کتب موجود ہیں۔ مولانا مودودی کی ''سنت کی آئینی حیثیت'' بھی ہمارے علمی ذخیرے کا حصہ ہے۔ حال ہی میں محترم شکیل عثمانی صاحب نے ''جناب غلام احمد پرویز کی فکر کا علمی جائزہ'' کے عنوان سے بعض نادر اور اہم تحریروں کا مجموعہ شائع

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

کر دیا ہے۔اس سارے کام نے ہماری علمی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں فکری پختگی ہے اور بڑی حد تک علمی دیانت بھی۔ میں ان کتابوں کا ذکر نہیں کر رہا جو مناظرانہ اسلوب میں لکھی گئیں۔اب دین کا ایک طالب علم دونوں اطراف کا موقف جان سکتا ہے اور موضوع زیر بحث کی اچھی طرح تنقیح ہو جاتی ہے۔

غزل اور جواب آں غزل کا سلسلہ آج بھی جاری ہے،مگر تنقیدی شعور کے بغیر۔اس سرمایے میں کم تنقید ایسی ہے جو علمی پختگی اور فکری دیانت کا مظہر ہو۔اس کی ایک مثال استاذ گرامی جاوید احمد صاحب غامدی پر بعض ہم عصروں کی ’جاری‘ تنقید ہے۔جاوید صاحب نے کچھ عرصہ پہلے امریکا کا سفر کیا۔اس دوران میں ایک لیکچر کے اختتام پر لوگوں کے سوالات کے جواب دیے۔ایک سوال یہ تھا کہ مسلمان معاشروں میں مذہبی انتہا پسندی کے اسباب کیا ہیں؟ انھوں نے یہ اسباب گنوائے اور ساتھ ہی ان کا حل پیش کیا تھا۔ان میں ایک حل یہ تھا کہ مسلم طلبا و طالبات کو بارہ سال کی وسیع البنیاد تعلیم دی جائے۔اس کے بعد وہ تخصص کے درجے میں جائیں۔اس مرحلے میں وہ چاہیں تو ڈاکٹر بنیں اور چاہیں تو عالم دین۔

جاوید صاحب نے اس سوال کے جواب میں جو نتائج فکر پیش کیے،اس کے دلائل انھوں نے تفصیل کے ساتھ اپنے بارہ خطبات میں بیان کیے جو امریکا کے شہر ڈیلس میں دیے گئے۔انھوں نے پہلے پانچ خطبات میں وہ دلائل بیان کیے جن کی بنیاد پر موجودہ مذہبی فکر کے بارے میں یہ راے قائم کی گئی۔اس کے بعد سات خطبات میں یہ بتایا کہ وہ اس انتہا پسندی کا جو حل تجویز کر رہے ہیں،اُس کے دلائل کیا ہیں۔یہ خطبات یوٹیوب پر موجود ہیں۔ان نتائج فکر پر تنقید ہو سکتی ہے۔اس کا صحیح طریقہ،مگر یہ ہے کہ پہلے ان دلائل کو رد کیا جائے جن کی بنیاد پر یہ نتائج مرتب کیے گئے ہیں۔اسی طرح اگر مجوزہ حل کی غلطی کو واضح کرنا مطلوب ہے تو اس کے لیے بھی لازم ہے کہ ان دلائل کو مخاطب بنایا جائے جن پر ان کی اساس رکھی گئی ہے۔

اگر تنقید کے لیے اس طریقے کو اختیار کیا جاتا تو مسلم سماج کا فکری سفر آگے بڑھتا۔پڑھنے والے کے سامنے دونوں اطراف کے دلائل ہوتے اور یوں اسے راے قائم کرنے میں مدد ملتی۔اس میں مسلمانوں کا بحیثیت مجموعی بھلا ہوتا۔اب اس کا اہتمام نہیں۔مثال کے طور پر جاوید صاحب اس سوال کا جواب دے رہے ہیں کہ مسلم معاشرے میں انتہا پسندی کیسے پیدا ہوئی؟ اس پر تنقید یہ ہو رہی ہے کہ انھوں نے امریکا کی دہشت گردی کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ کیا انھیں جاپان کی دہشت گردی یاد نہیں؟ اسی طرح جب وہ بارہ سال کی وسیع البنیاد تعلیم کا ذکر کرتے ہیں تو اس پر تنقید کرتے وقت کہیں یہ ذکر نہیں کہ اس تعلیم سے ان کی مراد کیا ہے؟ کیا یہ وہی بات ہے جو ’یونیورسل تعلیم‘ کے ذیل میں

بیان ہوتی ہے؟ کیا ناقد یہ جانتے ہیں کہ کیسے جاوید صاحب اس میں قرآن مجید کی تعلیم کو شامل کرتے ہیں؟

اس وقت اس تنقید کا تفصیلی جائزہ لینا مقصود نہیں۔ صرف یہ واضح کرنا ہے کہ تنقید کا کام کیسے ایک تعمیری سرگرمی بن سکتا ہے اور مسلم سماج کے مثبت ارتقا میں معاون ہو سکتا ہے۔ اگر تنقید کے بنیادی عوامل پیش نظر نہ رہیں تو ایک مفید کام بھی نہ صرف افادیت سے محروم ہو جاتا ہے، بلکہ فکری پراگندگی کا باعث بنتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

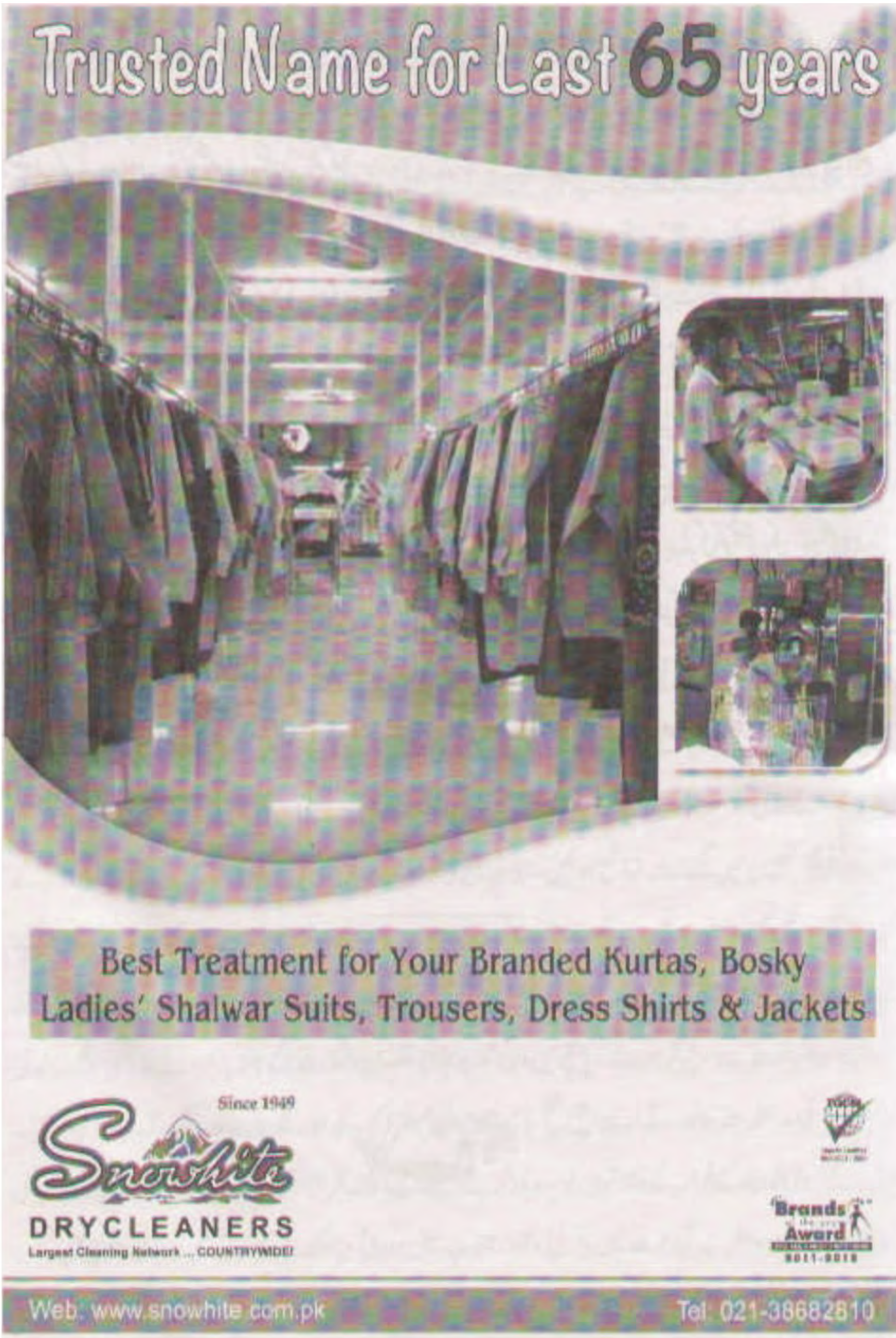

Trusted Name for Last 65 years
Best Treatment for Your Branded Kurtas, Bosky
Ladies' Shalwar Suits, Trousers, Dress Shirts & Jackets
Since 1949
Snowhite
DRYCLEANERS
Largest Cleaning Network ... COUNTRYWIDE!
Brands Award
Web: www.snowhite.com.pk
Tel: 021-38682810

Monthly
ISHRAQ
Lahore

Oct 2018
Vol.30 No.10
Regd No.CPL-183

Publisher : javed Ahmad Ghamidi printers : Qaumi Press, 50 Lower Mall Lahore

لئن شکرتم لازیدنّکم
اگر شکر کرو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا (القرآن)

PRAISE BE TO ALLAH, LORD OF THE WORLDS

150+ within 250 days
keep counting...

ALLIED SCHOOLS
Project of Punjab Group of Colleges

Allied Pre School
Allied School

Growing Together

Ar-Rahman Campus-JHELUM
Outside Classroom Education
Inter-Campus Transfer
Sahi Campus-SHAHKOT
Al-Fajar Campus-LAHORE
Ghazi Campus-OKARA
Rehman Campus-GUJRANWALA
Pak Campus-LAHORE
Web Portal
Parent-Teacher Meetings
Harbanspura Classic Campus-LAHORE
Sialkot Campus-SIALKOT
Al-Miraj Campus-LAHORE
Sibling Discount
Sir Syed Campus-LAHORE
Capital Campus-ISLAMABAD
Ellahabad Campus-ELLAHABAD
Cantt Campus-GUJRANWALA
Ferozpur Road Campus-LAHORE
Raiwand Road Campus-LAHORE
Sargodha Road Campus-FAISALABAD
Farooqabad Campus-FAROOQABAD
Jhelum Campus-JHELUM
Marrium Campus-JOHARABAD
Spoken English
Character Building
Grace Campus-LAHORE
Gojra Campus-GOJRA
Lodhran Campus-LODHRAN
Bhimber Campus-BHIMBER
Shakargarh Campus-SHAKARGARH
Standardized Curriculum
Shalimar Campus-FAISALABAD
Sahiwal Campus-SAHIWAL
Entry Test Preparation
DC Road Campus-GUJRANWALA
Ali Pur Chattah Campus-ALI PUR CHATTAH
Al-Ahmad Campus-LAHORE
Bahawalpur Campus-BAHAWALPUR
Mock Assessment
Educational Insurance
Tulip Campus-LAHORE
Satellite Town Campus-GUJRANWALA
Bilal Campus-BHALWAL
Professional Development of Teachers
Zafarwal Campus-ZAFARWAL
Attendance by SMS
Concept-Based Teaching
Wapda Town Campus-GUJRANWALA
Exclusive Early Years Education
Burewala Campus-BUREWALA
Husnain Campus-SAMBRIAL
Bedian Campus-LAHORE
Peshawar Road Campus-RAWALPINDI
Gulshan-e-Ravi Campus-LAHORE
Samanabad Campus-LAHORE
Sadar Campus-LAHORE
Satellite Town Campus-RAWALPINDI
GT Road Campus-GUJRANWALA
Kamalia Campus-KAMALIA
Extra & Co-curricular Activities
Ar-Raheem Campus-DINA
Walton Campus-LAHORE
Johar Town Campus (South)-LAHORE
Merit Scholarships
Career-Path Counseling
Akbar Campus-VEHARI
Hyderabad Campus-HYDERABAD
Samanabad Campus-FAISALABAD
Chauburji Campus-LAHORE
Sargodha Campus-SARGODHA
Kamoke Campus-KAMOKE
Dunyapur Campus-DUNYAPUR
Peoples Colony Campus-FAISALABAD
Hafizabad Campus-HAFIZABAD
Chichawatni Campus-CHICHAWATNI
Wazirabad Campus-WAZIRABAD
Subhan Campus-PATTOKI
PECO Road Campus-LAHORE
Art, Craft & Music
Allama Iqbal Town Campus-LAHORE
International Standards
Peoples Colony Campus-GUJRANWALA
Kasur Campus-KASUR
Al-Fateh Campus-KOT ABDUL MALIK
Dinga Campus-DINGA
Johar Town Campus (North)-LAHORE
Thana Campus-MALAKAND AGENCY
Ahmed Campus-RAHIM YAR KHAN
Faisalabad Campus-FAISALABAD
Swat Campus-SWAT
Lalamusa Campus -LALAMUSA
Salaar Campus-RAWALPINDI
Medina Campus-FAISALABAD
Teaching through Animation
Fatima Campus-DASKA
Adyala Campus-RAWALPINDI
Oasis Campus-BAHAWALPUR
Taunsa Campus Campus-TAUNSA SHARIF
Mumtaz Campus-MULTAN
Health & Hygiene Guidance
Rahim Yar Khan Campus-RAHIM YAR KHAN
English Medium
Jalal Pur Jattan Campus-JALAL PUR JATTAN
Bukhtiyari Campus-LAHORE
Narowal Campus-NAROWAL
Malakwal Campus-MALAKWAL
Sadiqabad Campus-SADIQABAD
DG Khan Campus-DERA GHAZI KHAN
Gujrat Campus (South)-GUJRAT
Mirpur Campus-MIRPUR AZAD KASHMIR
Playgroup to University Education
Quaid Campus-TOBA TEK SINGH
Model Town Campus-GUJRANWALA
Mandi Bahauddin Campus-MANDI BAHAUDDIN
Mouaz Campus-MANANWALA
Al-Ghaffar Campus-SARA-E-ALAMGIR
Chanab Campus-PARHIANWALI
Bhakkar Campus-BHAKKAR
Qila Didar Singh Campus-QILA DIDAR SINGH
Zalmas Campus-SHEIKHUPURA
Hujra Shah Muqeem Campus-HUJRA SHAH MUQEEM

Group Corporate Office, Allied Schools & Punjab Colleges. 64-E-I, Gulberg III, Lahore - Pakistan, Ph: 042 35756357-58.

www.alliedschools.edu.pk